NAEEM KAUSAR
HAYAAT AUR ADABI KARNAME

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN

(URDU)

2022

BARKATULLAH UNIVERSITY,
BHOPAL (M.P.)

PRESENTED BY :

SHAKEEL KHAN

UNDER THE SUPERVISION OF

Prof. ARJUMAND BANO

RESEARCH CENTRE
GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE, BHOPAL (M.P.)

NAEEM KAUSAR
HAYAAT AUR ADABI KARNAME

THESIS

SUBMITTED

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY (URDU)

2022

BARKATULLAH UNIVERSITY

BHOPAL (M.P.)

RESEARCH SCHOLAR

SHAKEEL KHAN

SUPERVISOR

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

Porf. ARJUMAND BANO

Professor Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & commerce
College, Bhopal. (M.P.)

PRINCIPAL
Govt. Hamidia Arts and
Commerce College, Bhopal

RESEARCH CENTRE

GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE, BHOPAL (M.P.)

نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے

مقالہ برائے ڈگری

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

2022

برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

پیش کردہ

شکیل خان

نگراں

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

پروفیسر ارجمند بانو

پروفیسر شعبۂ اردو

گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج، بھوپال

پرنسپل

PRINCIPAL
Govt. Hamidia Arts and
Commerce College, Bhopal

ریسرچ اسٹڈی سینٹر

گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج بھوپال۔ایم پی۔ 462001

NAEEM KAUSAR
HAYAAT AUR ADABI KARNAME

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN

(URDU)

2022

BARKATULLAH UNIVERSITY,
BHOPAL (M.P.)

PRESENTED BY :

SHAKEEL KHAN

UNDER THE SUPERVISION OF

Prof. ARJUMAND BANO

RESEARCH CENTRE

GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE, BHOPAL (M.P.)

NAEEM KAUSAR
HAYAAT AUR ADABI KARNAME

THESIS

SUBMITTED

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY (URDU)

2022

BARKATULLAH UNIVERSITY

BHOPAL (M.P.)

RESEARCH SCHOLAR

SHAKEEL KHAN

SUPERVISOR

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

Porf. ARJUMAND BANO

Professor Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & commerce
College, Bhopal. (M.P.)

PRINCIPAL
Govt. Hamidia Arts and
Commerce College, Bhopal

RESEARCH CENTRE

GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE, BHOPAL (M.P.)

نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے

مقالہ برائے ڈگری

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

2022

برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

پیش کردہ

شکیل خان

نگراں

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

پروفیسر ارجمند بانو

پروفیسر شعبۂ اردو

گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج، بھوپال

پرنسپل

PRINCIPAL
Govt. Hamidia Arts and
Commerce College, Bhopal

ریسرچ اسٹڈی سینٹر

گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج بھوپال۔ ایم پی۔ 462001

DECLARATION

BY THE CANDIDATE

I declare that the thesis entitled **"NAEEM KAUSAR HAYAAT AUR ADABI KARNAME"** is my own work conducted under the supervision of **Prof. ARJUMAND BANO** at **GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE BHOPAL** approved by Research Degree Committee. I have put in more than 200 days of attendance with the supervisor at the centre ,

I further declare that to the best of my knowledge the thesis does not contain any part of any work which has been submitted for the award of any degree either in this University without proper citation.

Candidate

SHAKEEL KHAN

Supervisor:

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

Prof. ARJUMAND BANO

PROFESSOR DEPTT. OF URDU
GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE
COLLEGE, BHOPAL (M.P.)

CERTIFICATE

OF THE SUPERVISOR

This is to certify that the work entitled "NAEEM KAUSAR HAYAAT AUR ADABI KARNAME" is a piece of research work done by SHAKEEL KHAN under my guidance and Supervision for the Degree of Doctor of Philosophy of Barkatullah university Bhopal (M.P.) India. That the candidate has put in an attendance of more than 200 days with me.

To the best of my knowledge and belief the thesis

(1) Embodies the work of the candidate himself has duly been completed.

(2) Fulfills the requirements of the Ordinance relating to the Ph.D. degree of the University; and is up to the standard both in respect of contents and language for being referred to the examiner.

Forwarded:

PRINCIPAL
Govt. Hamidia Arts and
Commerce College, Bhopal

(PRINCIPAL)

Govt. Hamidia Arts & Commerce College, Bhopal. (M.P.)

Signature of Supervisor:

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

Prof. ARJUMAND BANO

Professor Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College, Bhopal. (M.P.)

﴿۱﴾

پیش لفظ

میں مدھیہ پردیش کے ضلع ودیشہ تحصیل لٹیری کے ایک گاؤں محبت پور کے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد کھیتی کسانی کا کام کرتے ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں میں جب تین برس کا تھا جب ہی میری والدہ خاتون بی کا انتقال ہوگیا تھا۔ میرے والد نے بچوں کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ میں بہت چھوٹا تھا بڑی بہنوں نے پرورش کی میرے سبھی بہن بھائیوں کی تعلیم مدرسے تک محدود رہی یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بھوپال آ گیا۔ مجھے اچھے سے یاد ہے جب میں اردو میں ایم اے کرنے حمیدیہ کالج بھوپال پہنچا اس وقت کالج کے شعبۂ اردو میں میری ملاقات استاد محترمہ پروفیسر ارجمند بانو افشاںؔ سے ہوئی وہ کلاس میں سبھی بچوں کو بے حد دلچسپی سے پڑھاتی تھیں۔ میں اردو میں کمزور تھا کیوں کہ میں بنیادی طور پر کامرس کا طالب علم تھا۔ استاد محترمہ ارجمند بانو مجھے خصوصی توجہ سے پڑھاتی تھیں۔ چھٹّی کے دن گھر پر بھی پڑھا دیتی تھیں اور گھر پر اس طرح برتاؤ کرتیں جس میں غیریت کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ ان کی خصوصی توجہ اور رہنمائی میں میں نے فرسٹ ڈویژن سے اردو میں ایم اے کیا۔ میرے کئی سینئر ساتھی استاد محترمہ ارجمند بانو کے زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور شعبۂ اردو میں استاد محترمہ کے گرد جمع رہتے اور

لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ مجھے بھی پی ایچ ڈی کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں استاد محترمہ ارجمند بانو کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی۔ پی ایچ ڈی کورس ورک کی تیاری کے ساتھ استاد محترمہ کی محنت اور ان کے بتائے ہوئے طریقے کی بدولت میں نے MPSET-2016 میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ہمیشہ مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کرنے پر اُکساتی تھیں اور مطالعہ میں بے حد مدد کرتی تھیں جس کے نتیجے میں دسمبر ۲۰۱۸ء میں میں نے UGC NET کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور مولانا آزاد نیشنل فیلوشپ (MANF) میں میرا سلیکشن ہو گیا۔

استاد محترمہ نہ صرف اپنے تمام ہی طلباء کو محنت اور لگن سے پڑھاتی ہیں اور ان کی لکھی ہوئی تحریر کو نہایت باریک بینی کے ساتھ چیک کرتی ہیں اور غلطیوں کو درست کرتی ہیں۔ تحقیق اور تنقید کے باریک نکات بھی سمجھاتی ہیں اور میری غلطیوں اور کوتاہیوں پر ناراض بھی ہو جاتی ہیں مگر ان کا غصّہ وقتی ہوتا ہے۔

پی ایچ ڈی کرنے کے لیے اب موضوع کے انتخاب کا مسئلہ تھا وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے رجحان کے مطابق موضوع کا انتخاب کروں۔ مجھے بچپن سے افسانے پڑھنے کا شوق تھا۔ بھوپال میں مجھے ادبی محفلوں میں شامل ہونے کا موقع ملا اور کئی بار ملک گیر شہرت یافتہ افسانہ نگار جناب نعیم کوثر صاحب کو افسانے پڑھتے سنا۔ میری دلچسپی اتنی بڑھی کہ میں نے ان کے کئی افسانے پڑھ ڈالے ان کے چھ افسانوی مجموعے اردو میں اور ایک ہندی میں شائع ہو چکا ہے۔ میں نعیم کوثر کے افسانے اور پندرہ روزہ پرچہ ''صدائے اردو'' پابندی سے پڑھتا تھا۔ میں نعیم کوثر کا مدّاح بن چکا تھا۔

نعیم کوثر اگر چہ موجودہ دور کے بہترین افسانہ نگار، ناقد اور صحافی ہیں۔ عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں ان کا ایک منفرد مقام ہے۔ لیکن ان پر ابھی تک ایسی کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ جس میں ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کا مکمل احاطہ کیا گیا ہو۔

نعیم کوثر کی تمام خوبیوں کی بناء پر مجھے ان کی شخصیت اور فن پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی خواہش ہوئی جس کا ذکر میں نے اپنی شفیق استاد اور نگراں پروفیسر ارجمند بانو افشاںؔ سے کیا۔ انہوں نے میرے تحقیقی مقالہ کا عنوان ''نعیم کوثر حیات اور ادبی کارنامے'' منتخب کیا اور اپنی نگرانی میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھوانے میں نہایت خلوص اور محنت کے ساتھ ہر وقت میری رہنمائی کی۔ مقالہ تحریر کرنے کے دوران محترم نعیم کوثر صاحب سے بھی میں نے کئی مرتبہ رابطہ کیا۔ انہوں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی اور ہر ممکن تعاون دیا۔ مجھے اپنے مطبوعہ افسانوی مجموعے اور دیگر مواد بھی فراہم کروایا۔

میرے تحقیقی مقالے کا عنوان ''نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے'' ہے۔ جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ''اردو افسانے کی تاریخ بطور پس منظر (ابتداء تا حال) پیش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ''موجودہ دور میں بھوپال میں اردو افسانے کی صورت حال'' پر روشنی ڈالی ہے۔ تیسرے باب میں ''نعیم کوثر کے سوانحی حالات اور شخصیت، قلم بند کیئے ہیں۔

چوتھا باب ''نعیم کوثر بحیثیت افسانہ نگار'' ہے اور پانچویں باب میں نعیم کوثر کو بحیثیت صحافی اور ناقد پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ بہت سی نئی معلومات اس مقالے کے ذریعہ روشنی میں آئی ہیں اور نعیم کوثر کی

شخصیت کے کئی خوش نما پہلو اجاگر ہوئے اور ان کی تقریباً وہ تمام ادبی خدمات جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا اس مقالے میں یکجا ہوگئی ہیں۔

مقالے کے آخر میں ان کتابوں اور رسائل کی فہرست درج ہے جن سے میں نے اس مقالے کو تحریر کرتے وقت استفادہ کیا ہے۔

میں اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کا ذکر کرنا بھی لازمی سمجھتا ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں کسی نہ کسی اعتبار سے میری حوصلہ افزائی کی اور تعاون دیا۔

میں سب سے پہلے شکر گزار ہوں خدائے برتر کا جس کی مرضی اور مدد کے بغیر میں یہ مشکل مراحل نہیں طے کرسکتا تھا۔ اس کی ہی رحمت ہے کہ میرا مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں اپنی استاد محترمہ پروفیسر ارجمند بانو افشاںؔ کا جنھوں نے میری قدم قدم پر رہنمائی فرمائی اور میری غلطیوں کو درست کرنے کے ساتھ میری ذہنی تربیت بھی کی۔

میں اپنے والد محترم جناب اسماعیل خاں کا احسان مند ہوں جن کی بے پناہ محبت، شفقت اور دعاؤں نے میری رہنمائی کی انھوں نے مجھے کبھی معاشی کمزوری کا احساس نہیں ہونے دیا اور مجھے اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرانے کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔

میں شکر گزار ہوں استاد محترمہ کے شوہر جناب اظہار رسول صاحب، بہنوئی عبدالماجد صاحب، بہن انجم ماجد صاحبہ کا اور استاد محترمہ کے بھائی اقبال احمد صاحب، بھابی شاہین اقبال صاحبہ کا جنھوں نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور اپنی نیک خواہشات سے نوازا اور مجھے اپنے افرادِ خاندان کی طرح سمجھا۔

میں اپنے چچا سعید خاں چچی حسینہ بی ، بڑے بھائی ظہور خاں ، بھابی انیسہ بی ، بڑے بہنوئی گلفام خاں ، بہن شمیم بانو ، چھوٹے بہنوئی شاہد خاں بہن سیما بانو چھوٹے بھائی عبدالوکیل خاں اور میری اہلیہ عارفہ بی کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے دوران تعلیم گھر کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد رکھا تاکہ میں پوری توجہ سے یہ تحقیقی کام انجام دے سکوں۔

میں استاد محترمہ کے سینئر طلبہ اور ارباب قلم حمیدیہ کے فعال ممبر ڈاکٹر واجد خان ، ڈاکٹر شاکر خان ، ڈاکٹر ظفر خان ، ڈاکٹر ایاز خان سرونج ، ڈاکٹر عاشق حسین بیگ ، ڈاکٹر ہلال احمد شاہ ، ڈاکٹر سرتاج احمد پرے ، ڈاکٹر ارشاد احمد کاندری ، محمد دانش ، محمد سلمان ، محمد عاقل ، سید سرفراز علی کا بھی شکر گزار ہوں جو میرے ساتھی ہیں جنہوں نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی اور مدد کی۔

میں ڈاکٹر نعیم انصاری کا بھی شکر گزار ہوں جو میرے مقالے کے کاتب بھی ہیں جنہوں نے میری بہت مدد کی اور بھرپور تعاون دیا۔

شکیل خان

ترتیب ابواب

ترتیب ابواب

Abstract

یہ تحقیقی مقالہ جس کا عنوان ''نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے'' ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان پر تحقیقی نگاہ کی جائے تو اس مقالے کی تکمیل کے ساتھ بہت سی نئی معلومات فراہم ہوئی ہیں اور فراہم شدہ معلومات کی تصحیح اور تفصیلات میں بھی اضافہ ہواہے۔

نعیم کوثر اس عہد کے نامور افسانہ نگار اور صحافی ہیں ان کا تعلق بھوپال سے ہے اور بھوپال میں اچھے نثر نگاروں اور خاص طور پر فکشن نگاروں کی تعداد کم ہے۔ نعیم کوثر ایک بلند، معیاری افسانہ نگار ہیں۔ ان کے مطبوعہ افسانوی مجموعوں میںشامل افسانوں کی تعداد ۶۹ ہے۔

بیشتر افسانے اردو افسانہ نگاری کے فن پر ہی پورے نہیں اترتے بلکہ ان کے موضوعات اور کردار موجودہ سماج کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے سماج کی حقیقتوں کے ساتھ انسانی کرداروں کی نفسیات پر بھی ان کی گہری نگاہ کے غمّاز ہیں۔ اس مقالے کاپہلا باب ''اردو افسانے کی تاریخ بطور پس منظر (ابتداءتا حال) ہے۔ اس میں اردو افسانے کا تعارف پیش کیاگیا ہے اور اردو افسانہ نگاری کی تاریخ تفصیل سے اور جامع انداز میں پیش کی ہے۔ تاکہ کوئی بھی اہم افسانہ نگار چھوٹ نہ پائے اور فن افسانہ نگاری کے ارتقاءمیں اس کا حصّہ پوری طرح واضح رہے۔ یہ باب اس لیے اہم ہے کہ اس میں افسانہ نگاری کے پس منظر کے ساتھ اس کے تدریجی ارتقاءپر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے پس منظر کو مدّنظر رکھ کر ہی اگلا باب یعنی ''موجودہ دور میں بھوپال میں اردو افسانے کی صورتِ حال'' ترتیب دیاگیا ہے اس میں بھوپال کے ان اہم افسانہ نگاروں کو پیش کیاگیا ہے۔ جنہوننے بھوپال میں اردو افسانے کی صنف کو ترقی دی اور اس کاوقار اور معیار بلند کیا اس باب میں بھوپال کے افسانہ نگاروں اور افسانوی ادب کابھر پور جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور ان نئے لکھنے والوں کوبھی نظر انداز نہیں کیا ہے جنہوننے چند افسانے ہی لکھے ہیں یاپھر ان کا ایک ہی مجموعہ منظر عام پر آیا ہے کچھ نئے نام بھی اس فہرست میں شامل ہوئے ہیں مثلاً ڈاکٹر شفیقہ فرحت، فیروزہ یاسمین، پری خانم،سلطانہ حجاب اور پروفیسر ارجمند بانو افشاں وغیرہ۔

باب سوم ''نعیم کوثر کے سوانحی حالات اور شخصیت'' ہے۔ نعیم کوثر کے سوانحی حالات میں ابتداً ان کا شجرہ تحقیق کے بعد تحریر کیا ہے۔ نعیم کوثر کے والد نامور فکشن نگار کوثر چاندپوری کے یومِ پیدائش اور سنہ پیدائش کے سلسلے میں کئی اختلافات ہیں ان پر غوروفکر کرنے کے بعد دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر نازنین خان کی تحقیقی کتاب ''وقارِ علم و حکمت: کوثر چاندپوری''جوکوثر چاندپوری پر ان کا پی ۔ ایچڈی کا مقالہ ہے۔ اس میں کوثر چاندپوری کی سنہ پیدائش صفحہ ۰۳ پر ۸اگست ۰۰۹۱ءتحریر کی ہے۔ اسی کتاب میں شامل ڈاکٹر مظفر حنفی کے مضمون میں بھی صفحہ ۵ پر بھی ۸ اگست ۰۰۹۱ءہے۔ ''وقار علم و حکمت:کوثر چاندپوری'' میں نعیم کوثرنے مختلف شواہد کی روشنی میںکوثر چاندپوری کی سنہ پیدائش ۸۱اگست ۰۰۹۱ تحریر کی ہے۔ جوکوثر چاندپوری کی سروس بک کے مطابق ہے اور اسی کو درست ماننا مناسب ہے۔

نعیم کوثر کے سوانحی حالات میں ان کی جائے پیدائش ظفر احمد نظامی کے تحریر کردہ خاکہ ''نعیم کوثر۔۔۔ایک تعارف'' میں بیگم گنج (ضلع رائسین) میں تحریر کی ہے۔ نعیم کوثر صاحب سے اس سلسلے میں بات کی تو ناراض ہو کر بولے تم کیا مجھے بیگم گنجی لکھوگے۔ ہم نے کہا آپ تو بھوپالی ہیں۔ ظفر احمد نظامی صاحب نے آپ کے خاکہ ''نعیم کوثر۔۔۔ ایک تعارف'' میں بیگم گنج بتایا ہے۔ پھر انہوننے بتایا کہ والد صاحب ملازمت کے دوران بیگم گنج میں رہے اور وہیں ۵۱دسمبر ۶۳۹۱ءکو میں پیداہوا تھا۔

باب چہارم میں ''نعیم کوثر بحیثیت افسانہ نگار'' پیش کیاگیا ہے۔ اس مقالے کو تحریر کرنے کے دوران نعیم کوثر کا ایک افسانوی مجموعہ ''کہرے کا چاند'' ۸۱۰۲ءمیں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب اقبال مسعود کی ترتیب دی ہوئی ''نعیم کوثر کی افسانوی کائنات'' کے عنوان سے ۱۲۰۲ءمیں منظر عام پر آئی اس میں اردو ادب کے نامور ادیبوں اور ناقدوں کے نعیم کوثر کی افسانہ نگاری پر تبصرے، تجزیہ اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب سے پہلے نعیم کوثر پر لکھے گئے مضامین کی ایسی کوئی کتاب نہیں ملتی جس میں ان پر تنقیدی مضامین لکھے ہوں۔ اس باب میں نعیم کوثر کے افسانوں کاگہری نگاہ سے مطالعہ کیا اور ان کے افسانوں کے موضوعات، کردار نگاری، جذبات نگاری، طرز بیان اور ٹیکنیک پر معتبر ناقدین کی آراءکو شامل کرکے تبصرہ اور تجزیہ کیاگیا ہے اور اس کے ذریعہ درحقیقت ان کی افسانہ نگاری کی خوبیاں اور اردو افسانہ نگاروں میں ان کے مقام کاجائزہ لیا گیا ہے۔ بلاشبہ اس مقالے کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ نعیم کوثر کو اردو افسانہ نگاروں کی صف میں مناسب اور جائز مقام دیاجاسکے۔

اس مقالے کا باب پنجم ''نعیم کوثر بحیثیت صحافی ،بحیثیت ناقد'' ہے۔ بھوپال میں صحافت کے تعلق سے نعیم کوثر کوکافی بلند مقام حاصل ہے جہاں بھی بھوپال میں صحافت کا ذکر ہوتا ہے نعیم کوثر کانام

سرفہرست ہوتا ہے۔ لیکن ان کی صحافتی خدمات کامکمل جائزہ اس مقالے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ان کی اس ابتدائی کوشش کا بھی ذکر ہے جو انہوننے اردو زبان و ادب سے سچی اور بے لوث اردو محبت کے ثبوت میں بچوں کا رسالہ ''جگنو'' جاری کرکے دیا۔ انہوننے اس وقت میں ایسی خدمت اپنے سر لی جب ان کے پاس بچّوں کا رسالہ جاری کرنے کے لیے کوئی علیحدہ فنڈ نہیں تھا۔ اسی طرح پندرہ روزہ پرچہ ''صدائے اردو'' ۲۰۰۱ءمیں جاری کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بھوپال کیامدھیہ پردیش سے بھی کوئی باقاعدہ اور معیاری جریدہ شائع نہیں ہورہا تھا۔ نعیم کوثر نے اس کمی کو محسوس کیا اور صرف نعرے بازی کے بجائے صحافت کے میدان میں یہ گراں قدرپرچہ جاری کیا۔ یہ بے لاگ اور بے باک پر چہ جو ادبی اعتبار سے بھی معیاری تھا۔ اخلاقی، شعری، ادبی، سیاسی، سماجی،معاشی اور معاشرتی اعتبار سے یہ پرچہ بڑی اہمیت کا حامل رہا۔ صحافت میں نعیم کوثر کی ادبی خدمات کو تو اس باب میں پیش کیا ہی گیاہے۔ لیکن اس اخبار میں شائع ہونے والی ان کی تحریروں، اداریوں اور خبروں کے علاوہ دیگر کئی لوگوں کی کتابوں پر لکھے گئے ان کے تنقیدی مضامین اور نوٹ بھی اس باب میں پیش کئے گئے ہیں اور جن کی روشنی میں وہ ایک ترقی پسند نظر یہ کے حامی اور حق پسند ناقد نظر آتے ہیں۔ ناقد کی حیثیت سے ابھی تک ان کی تحریروں پر کوئی ایسا مضمون یا کتاب نہیں ملتی جس میں انہیں ناقد کی حیثیت سے جانچا پرکھا گیاہو۔ اس مقالے کے ذریعہ ان کی حیثیت ایک تنقید نگار کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔

آخر میں ان کتابیات، رسائل اور اخبارات کی فہرست ہے۔جن سے اس مقالے کو تحریر کرنے میں مدد لی گئی ہے۔

بہرحال بحیثیت مجموعی نعیم کوثر پرایک مکمل اور جامع مقالہ بنانے کی میری کوشش رہی ہے کہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہے۔ میں نے اس مقالے ''نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے'' کو ایک ادبی دستاویز کی شکل دینے کی کوشش کی ہے تاکہ نعیم کوثر پر آئندہ کام کرنے والوں کی رہنمائی ہوسکے۔

باب اوّل

اردو افسانے کی تاریخ بطور پس منظر

(ابتداء تا حال)

اردو افسانے کی تاریخ بطور پس منظر

(ابتداء تا حال)

اردو میں مختصر افسانہ مغرب سے آیا۔ یہ ایک جدید صنف ادب کی حیثیت سے انیسویں صدی کے آخر میں رائج ہوا۔ پرانے زمانے میں ادیب بڑی دلچسپ داستانیں لکھا کرتے تھے۔ جن کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ پھر زمانہ بدلا اور لوگوں کی مصروفیت بڑھی تو داستانوں کی جگہ ناولیں لکھی جانے لگیں۔ لیکن بیسویں صدی کے مشینی دور میں لوگوں کے پاس ناولیں پڑھنے کا بھی وقت نہ رہا۔ جس کی وجہ سے کہانیاں اور مختصر افسانے لکھے اور پڑھے جانے لگے۔

ملک کے بدلتے ہوئے حالات، نئے خیالات اور ادب کے نئے تقاضوں کی وجہ سے مختصر افسانہ وجود میں آیا، تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے اور دماغی طور پر مصروف رہنے والوں کے لیے مختصر افسانہ، ناول اور داستان سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔

بہر حال افسانہ مغرب سے اردو میں آیا۔ مختصر افسانہ جدید ادب کی ایسی ادبی صنف ہے جو ایجاز واختصار، جدّت اور تخیل کی چاشنی سے مرکب ہے اور جو ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اردو میں افسانہ شارٹ اسٹوری (Short Story) کا بدل ہے افسانے کے لغوی معنی چھوٹی بات، داستان، قصہ کہانی، سرگذشت حال، روداد، طویل بات، ذکر مذکورہ، چرچا وغیرہ ہیں۔ اردو افسانے

کی پیدائش کے سلسلے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''اردو افسانے کی روایت میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس کے باعث مختصر افسانہ فطری طور پر رائج ہوتا۔ اس کا بیج یہاں کی ادبی زمین میں نہیں پھوٹا بلکہ مغرب سے اس کا پودھا لاکر لگایا گیا''[1]

دی انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں شارٹ اسٹوری کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"Short Story , brief fictional process narrative that is shorter than a novel and that usually deals with only a few characters. The short story is usually concerned with a single effect conveyed in only one or few significant episodes or scenes........The short story had its precedents in ancient Greek fables and brief romances, the tales of the Arabian Nights."[2]

گویا افسانہ میں زندگی کے کسی ایک گوشے، کسی ایک واقعہ یا کسی ایک نفسیاتی حقیقت کو موثر طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ناول میں قاری کی توجہ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف ہوتی ہے لیکن مختصر افسانہ میں عام طور پر ایک واقعہ ہی قاری کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔

وقار عظیم نے اپنی کتاب ''فنِ افسانہ نگاری'' میں ایلن پو، اے جے جے ریٹ گلف، ایچ جی ویلس، چیخوف، میں الزبتھ بووین، ای جی اوبرین اور دیگر ممتاز مغربی ادیبوں اور فنکاروں کے حوالے سے افسانہ کی متعدد تعریفیں درج کی ہیں اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''افسانہ نثر کی ایک مختصر بیانیہ تحریر (تخلیق) ہے جو ایک واحد ڈرامائی

---

[1] دنیائے افسانہ۔ از عبدالقادر سروری۔

[2] بحوالہ اردو افسانہ ترقی پسند تحریر سے قبل۔ از پروفیسر صغیر افراہیم۔ ص ۱۳

واقعے کو ابھارتی ہے، جس میں کسی ایک کردار (یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ) کے نقوش نمایاں کئے جاتے ہیں۔ اس میں کردار کی ذہنی کشمکش یا اس کی زندگی کا کوئی ایک واقعہ بھی شامل ہے اور واقعات کی تفصیل اتنے اختصار اور ایجاز کے ساتھ کی جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس کا ایک (واحد) تاثر قبول کرے''[۱]

بہرحال افسانے کی کوئی ایک جامع تعریف مشکل ہے۔ افسانہ نگاری میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ افسانہ نگار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے موضوع کو مختصر انداز میں بیان کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے میں کرداروں کی مکمل زندگی سامنے نہیں آتی ہے بلکہ اس کی زندگی کا کوئی خاص پہلو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ افسانے کے اجزاء میں بھی کسی قدر اختلاف ہے دیگر اصناف ادب کی طرح افسانے کے بھی مختلف اجزاء یا عناصر ہوتے ہیں۔ اور زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی طرح اس کے عناصر میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے تشکیلی عناصر میں پلاٹ، کردار، ماحول، فضا، وحدتِ تاثر، موضوع اور اسلوب کو اہمیت حاصل ہے۔

پلاٹ:

افسانے میں پلاٹ کی حیثیت مسلّم ہے کہانی مکمل طور پر اسی پر منحصر ہوتی ہے۔ پلاٹ میں کہانی کے واقعات کو ترتیب سے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں جیسے سادہ پلاٹ، پیچیدہ پلاٹ، غیر منظّم پلاٹ، ضمنی پلاٹ وغیرہ ابتدائی دور میں سادہ پلاٹ زیادہ مقبول رہے۔ ناقدین نے پلاٹ کا پہلا جز افسانہ کا عنوان قرار دیا ہے کہا جاتا ہے کہ عنوان میں کشش اور معنویت ہونی چاہیئے کہ قاری سرخی دیکھ کر افسانہ پڑھنے پر آمادہ ہو جائے۔ اچھے عنوان کی پہلی شرط افسانے کے

---

[۱] فن افسانہ نگاری۔ از سید وقار عظیم۔ ص ۱۶

موضوع سے اس کی مناسبت ہے۔ دوسری خصوصیت اس کا مختصر ہونا ہے اور تیسرا وصف اس کا نیا پن ہے۔افسانے میں پلاٹ کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی رقمطراز ہیں:

''افسانہ ادب کی سب سے بڑی حقیقت پسند صنف ہے۔۔۔ اگر تنقیدی نگاہ سے غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ افسانے کی حقیقت پسندانہ افسانویت یا افسانوی حقیقت پسندی کا دارومدار ماجرا سازی پر ہے۔ یہ ماجرا ہی ہے جو افسانے کو ایک مربوط قصّہ اور ایک دلچسپ کہانی بناتا ہے۔اگر ماجرا نہ ہوتو افسانے کے نام پر جو بیڈول ہیولا پیش کیا جائیگا وہ محض چند منتشر احساسات یا ناقابل فہم تجربات کا ایک خوابِ پریشاں ہوگا جس کی تعبیر شاید افسانہ نگار کو بھی معلوم نہ ہو اور قاری کے لیے تو یہ ایک معمّہ ....کوئی افسانہ اگر واقعہ سے خالی ہوتو فقط انشا پردازی اور فلسفہ طرازی اسے افسانہ نہیں بنا سکتی''[1]

درحقیقت افسانے کا پلاٹ ہی اس کا اسٹرکچر بناتا ہے جس پر افسانے کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

کردار:

افسانے میں رونما ہونے والے حادثات اور واقعات میں ملوث ہونے والے نفوس کردار کہلاتے ہیں۔افسانے میں کرداروں کی تعداد کم ہوتی ہے اور ان سے زندگی کے کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔کردار جتنا فعال اور جاندار ہوگا۔ افسانہ اسی قدر توانا ں ہوگا۔ افسانے میں چونکہ مختصر وقت اور الفاظ میں کردار کے تاثر کو پوری طرح ابھارنا مقصود ہوتا ہے اس لیے افسانہ نگار کو زیادہ احتیاط اور فنی باریکیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔اس سلسلے میں وقار عظیم اپنی کتاب ''فنِ افسانہ نگاری میں لکھتے ہیں:

---

[1] تنقیدِ مشرق۔از عبدالمغنی۔ص۷۔۸

''افسانے کے وجود کے لیے افسانے کی تحریک، اس کے موضوع اور مواد، اس مواد کی فنّی ترتیب اور پلاٹ کو جتنا ضروری اور اہم بتایا گیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن اتنے ہی بلکہ بعض حیثیتوں سے اس سے بھی زیادہ ضروری خود افسانوی کردار ہیں۔''[۱]

شمس الرحمٰن فاروقی افسانے کے کردار کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ای ایم فارسٹر نے بھی کردار کو پلاٹ سے مقدم کیا۔ اگرچہ وہ ہنری جیمس کی حد تک نہیں گیا ہے۔ لیکن ان دونوں نے پلاٹ کے مقابلے میں کردار کو (یعنی واقعات کی کثرت کے مقابلے میں کردار کی نفسیاتی اور ظاہری تصویروں میں تنوع کو) اہمیت اس لیے دی ہے کہ انسانی توجہ کو برانگیختہ کرنے کے لیے کردار جتنا کارآمد ہے، واقعہ اتنا کارآمد نہیں''[۲]

ماحول اور فضا:

افسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع کے مطابق ماحول اور فضا تشکیل دے۔ تاکہ افسانے کی تاثیر میں اضافہ ہو۔ اس سلسلے میں سنبل نگار رقمطراز ہیں:

''افسانے میں ماحول اور فضا کی بہت اہمیت ہے۔ فضا آفرینی کامیاب افسانہ نگاری کے لیے بہت ضروری ہے''[۳]

مناسب فضا سے کہانی کے تاثر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ فضا آفرینی سے مراد ہے کہ افسانہ نگار ماحول کی ایسی تصویر کھینچے کہ قاری کی نگاہ کے سامنے پورا منظر گھوم جائے۔ کرداروں کو اس طرح پیش

---

۱ فن افسانہ نگاری۔ از وقار عظیم۔ ص۱۴۴۔

۲ بحوالہ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل: از پروفیسر صغیر افراہیم۔ ص۱۹۔

۳ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ از سنبل نگار۔ ص۱۴۸

کرے کہ دل میں برے کرداروں سے نفرت اور اچھے کرداروں سے ہمدردی پیدا ہو جائے جن افسانہ نگاروں نے ماحول کی تصویر کشی، کرداروں کی جذباتی کیفیات اور فضا آفرینی پر زیادہ توجہ کی وہ زیادہ کامیاب افسانے پیش کر سکے۔

اسلوب:

پلاٹ کی فنی تاثیر، ترتیب، جیتے جاگتے کردار و مناظر کی مصوری اور فضا کی تاثیر کے لیے حسن بیان پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ہر فنکار کا اسلوب مختلف ہوتا ہے اور یہ اسلوب ہی ہے جو ایک فنکار کو دوسرے فنکار سے ممتاز و ممیّز کرتا ہے۔ اسلوب کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:

(۱) بیانیہ اسلوب (۲) سوانحی اسلوب (۳) مرسلاتی اسلوب (۴) مخلوط اسلوب۔

ایک اچھا اسلوب اپنے اندر سحر کی سی تاثیر اور مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ اور قاری کے ذہن پر دیرپا تاثر چھوڑتا ہے نیز فنکار کو حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے اپنی تنقیدی کتاب ''اعتبارِ نظر'' میں نئے افسانے کی ٹیکنیک پر اس طرح سے اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''افسانہ نگار اپنے رجحان کے مطابق موضوع چنیں گے۔ لیکن جب وہ اسے پیش کریں گے تو فن کے کچھ لوازم ہوتے ہیں، ان کا احترام کریں گے، ان کو پیش نظر رکھیں گے اور یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ لکیر کے فقیر ہوں اور جس طرح سے دوسروں نے افسانے لکھے ہیں وہ بھی ویسے ہی افسانے لکھیں۔ ان کا جی چاہے فن میں تجربے کریں اور ان فنی تجربوں کو ایسی شکل دیں جو انفرادیت کی حامل ہو، لیکن انہیں اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان کا فن، موضوع اور ذاتی تجربے عام لوگوں کے تجربوں کی دسترس میں آجائے۔۔۔ موضوع

اور مواد کو پیش کرنے کی ٹیکنیک اظہار کا ذاتی طریقہ ہے۔ موضوع اور ٹیکنیک کے لحاظ سے جسے مختصر افسانہ کہا جاسکے اس کی حدیں کافی وسیع ہیں۔۔۔ اچھا لکھنے والا جب اپنے انداز سے اپنا مواد پیش کرتا ہے تو اس کی ٹیکنیک الگ ہو جاتی ہے۔ کوئی تفصیلات میں جاتا ہے، کوئی واقعات کو مختصر طریقے سے پیش کرتا ہے، کوئی فضا اور تاثر پر زور دیتا ہے، کوئی مرکزی خیال پر''[1]

موضوع:

افسانے میں موضوع کی بھی بڑی اہمیت ہے کیونکہ موضوع اگر اچھوتا، نیا اور متاثر کن ہے تو افسانہ بھی کامیاب اور یادگار ہوگا۔ اگر موضوع ہی پامال اور کمزور ہوگا تو افسانہ بھی پامال اور کمزور ہوگا۔ افسانے کا موضوع ہماری حقیقی زندگی سے ہی متعلق ہونا چاہیئے ، غرض موضوع افسانے کی روح ہوتا ہے۔ یہ کردار، پلاٹ، زبان، وحدت تاثر اور اسلوب تمام اجزاء کو متاثر کرتا ہے اور متحد بھی رکھتا ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو موضوع کے انتخاب میں محتاط ہونا چاہیئے ۔

افسانے کا موضوع گردوپیش کے سماج سے لینا چاہیئے اور اس کا اسلوب واضح ، دلچسپ اور زود فہم ہونا چاہیئے ۔ اس سلسلے میں عبدالمغنی اپنی کتاب ''تنقیدِ مشرق'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ شاعری بھی نہیں جس پر غور وفکر سے معانی کی تہیں کھلتی ہیں اور لطف و انبساط میں اضافہ ہوتا ہے۔ افسانے کی پہلی اپیل بدایۃً قصّے کی دلچسپی میں ہے۔ جس طرح شاعری کی پہلی اپیل اس کے خاص نغمے میں ہے۔ اگر پہلی اپیل ہی نہ ہو تو پھر کوئی فن پارہ قاری کے دل و دماغ تک پہنچ نہیں سکتا۔ یہ ترسیل کا المیہ اور ابلاغ کا فقدان ہے۔''[2]

---

[1] اعتبارِ نظر۔ از احتشام حسین۔ ص ۱۷

[2] تنقید مشرق۔ از عبدالمغنی۔ ص ۱۰

وحدتِ تاثر:

وحدتِ تاثر اردو افسانے کا لازمی جزو بھی ہے اور ناگزیر ''شناخت'' بھی یعنی یہی ایک وصف ایسا ہے جس کی بنیاد پر افسانے کو ناول سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ دوسرے لوازمات تو اکثر ناول میں مل جاتے ہیں۔ افسانہ نگار وحدت تاثر کو قائم رکھنے کے لیے کردار، واقعہ یا بیان تمام صورتوں سے کام لے سکتا ہے اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ بات جو وہ کہنا چاہتا ہے پوری اثر انگیزی کے ساتھ افسانے میں نظر آئے اور قاری اس کو شدت سے محسوس کرے۔ افسانے میں پیش کیا جانے والا تاثر جس قدر توانا اور مضبوط ہوگا افسانہ اسی قدر کامیاب کہلائے گا۔

وحدتِ تاثر پر اظہار خیال کرتے ہوئے احتشام حسین رقمطراز ہیں:

> ''مختصر افسانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو اپنی گہرائی اور حد بندی کے لحاظ سے زندگی کے چند عناصر پر مبنی اور چند پہلوؤں تک وسیع ہو سکتا ہے اس کے مختصر سے خاکے میں چند کردار، چند واقعات اور چند عناصر سے زیادہ نہیں سما سکتے۔ پھر چاہے کسی مخصوص ٹیکنیک کی پابندی نہ بھی کی جائے۔ تو وحدتِ زماں و مکاں اور وحدت تاثر کا کسی حد تک خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔''[۱]

اردو افسانے کا ارتقاء:

گویا اردو میں مختصر افسانے کی باقاعدہ ابتداء بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ افسانے کا آغاز امریکہ کے ایک مصنف واشنگٹن اروِن نے ''اسکیچ بک'' لکھ کر کیا۔ افسانے کا خمیر اردو کی قدیم داستانوں قصے کہانیوں میں پہلے سے ہی تھا مگر اردو میں باقاعدہ طور پر یہ صنف جدید مغربی ادب کی دین ہے۔ منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش نے مختصر افسانے کے اولین

۱؎ تنقید اور عملی تنقید۔ از احتشام حسین۔ ص ۳۹

نمونے پیش کئے۔اردو کے پہلے مطبوعہ افسانے کے متعلق ڈاکٹر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''تاریخی اعتبار سے ۱۹۰۰ء کے معارف میں شائع ہونے والا اردو کا پہلا افسانہ سجاد حیدر یلدرم کا تھا۔لیکن جدید اردو افسانے کے موجد پریم چند ہیں۔اوران کی رہنمائی میں ہی اردو افسانے نے موضوع وفن دونوں لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کی۔''[۱]

اردو افسانے کے ارتقاء سے متعلق پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''یہ اردو افسانے کی خوش قسمتی ہے کہ دو بہت اچھے فنکار اس کو ابتداء ہی میں مل گئے پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم اور دونوں نے اسے گھٹنوں چلنے سے بچالیا اور اسے شروع ہی میں جوان بنا کر پیش کر دیا۔''[۲]

منشی پریم چند افسانہ نگاری میں ایک بہت ہی اہم نام ہے۔پریم چند واحد ایسے فنکار ہیں جنہوں نے افسانوں اور ناولوں میں حقیقت کی روح پھونک دی۔اور ادب میں سچائی کو پیش کیا اور ادب کو خیالی اور شہری زندگی سے نکال کر دیہاتی اور حقیقی زندگی سے متعارف کرایا اور دیہاتی زندگی کو موضوع بنا کر ان کے مسائل کو پیش کیا۔ابتداء میں پریم چند نے بنگالی زبان کے افسانوں سے اثر قبول کیا اور ان کا پہلا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا اور اسی سال انکا پہلا افسانوی مجموعہ ''سوزِ وطن'' بھی شائع ہوا۔پریم چند نے تقریباً تین سو افسانے لکھے جن میں بیشتر افسانے کسی نہ کسی صورت میں جذبۂ حب الوطنی، دوستی اور سماج کے سلگتے مسائل پر معمور ہیں۔ان کے مشہور افسانوں میں کفن، عید گاہ، پنچایت، بوڑھی کاکی، بڑے گھر کی بیٹی، پوس کی رات، ٹھاکر کا کنواں،

---

[۱] اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل۔از پروفیسر صغیر افراہیم۔ص ۲۷

[۲] اعتبارِ نظر۔از پروفیسر احتشام حسین۔ص ۱۰۵

طلوع محبت، دو بیل، سجان بھگت، نمک کا داروغہ، وغیرہ ہیں۔ یہ سبھی دیہاتی زندگی، غربت وافلاس، کسانوں کی زندگی اوران کے مسائل سے پُر ہیں۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:

> ''پریم چند کی شاہ کار کہانیاں وہی ہیں جو گاؤں کے ماحول اور زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔۔۔۔ ان کہانیوں میں پریم چند نے اپنے تجربات، اپنے تخیل کی شادابی اور نفسیاتی بصیرت سے جو محاکاتی حسن پیدا کردیا وہ اس عہد کی دوسری کہانیوں میں کم نظر آتا ہے۔ان میں سے ہر کہانی انسانی زندگی یا انسانی نفسیات کے کسی گوشہ کو اس طرح بے نقاب کرتی ہے کہ قاری سوچتا رہ جاتا ہے۔''پوس کی رات'' میں ایسا لگتا ہے جیسے مصنف نے اپنے وجود کو ہلکو کسان کے وجود سے کامل طور پر ہم آہنگ کرلیا ہو۔''[1]

غریب طبقے کے مسائل کی نمائندگی پریم چند نے بڑی حقیقت نگاری کے ساتھ کی ہے۔اس سلسلے میں امرت رائے اپنے رسالہ ''شانتی کی جودھا'' میں رقمطراز ہیں:

> ''پریم چند کا تمام فکری سرمایہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے سماج کے سب سے درماندہ اور مظلوم طبقے پر غیر منصفانہ طبقاتی جبر کو تسلیم نہ کرنے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی''[2]

پریم چند نے اپنے افسانہ ''نمک کا داروغہ'' کے ذریعہ گاؤں کے ایک مضبوط ارادے والے ایماندار، نیک اور فرض شناس نوجوان کا کردار پیش کیا ہے۔ وہ فرض کے راستے میں اپنی نوکری کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اور وہ حالات بھی دکھائے ہیں جہاں دولت مند لوگ اپنی دولت کے بلبوتے پر قانون سے بھی بچ جاتے ہیں۔جس کا خلاصہ اس طرح بیان ہے:

---

[1] پریم چند کے نمائندہ افسانے۔مرتب پروفیسر قمر رئیس۔ص ۲۰

[2] شانتی کی جودھا ہندی رسالہ۔امرت رائے۔ص ۴۸

''صیغۂ نمک'' کے محکمہ میں منشی بنسی دھر کو داروغہ کی نوکری ملی۔ ان کے باپ نے انہیں اپنی اس نوکری میں رشوت لینے کا سبق سکھایا۔ بنسی دھر نہایت ایماندار اور مضبوط اوصاف کا محنت کش انسان تھا اور رشوت کو حرام سمجھتا تھا۔ پہلے ہی مرحلے میں اس نے بہت بارسوخ سیٹھ پنڈت الوپی دین کی نمک سے بھری ہوئی تمام گاڑیاں پکڑ لیں جو کہ چوری چھپے نمک کی نقل و حرکت قانوناً جرم تھی۔ بنسی دھر کی سختی دیکھ کر الوپی دین خود گاڑیاں چھڑوانے آئے اور بنسی دھر کو بھاری رقم رشوت کے طور پر دینا چاہی لیکن بنسی دھر نے سب کو اریسٹ کروادیا۔ الوپی دین نے عدالت میں پیسہ کھلوا کر نہ صرف اپنی گاڑیاں چھڑوالیں بلکہ بنسی دھر کو عدالت کے ذریعہ نوکری سے معطل کروادیا۔

بنسی دھر کے باپ اس واقعہ سے سخت ناراض ہوئے اور اسے بہت برا بھلا کہا۔ لیکن چند روز بعد سب حیران رہ گئے جب الوپی دین خود بنسی دھر کے گھر آئے اور اسے اپنے تمام کاروبار کا مختار بنانے کے کاغذات پر دستخط کروانے کے لیے بضد ہو گئے۔ بنسی دھر کے لاکھ انکار کرنے پر بھی وہ نہ مانے۔ اس کے بعد کیا ہوا پریم چند نے بڑے ہی پُر اثر انداز میں لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:

> ''الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے۔ مجھے نہ علم کی ضرورت ہے۔ نہ فراست کی۔ نہ کارکردگی کی اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بارہا پرکھ چکا ہوں۔ اب حسن تقدیر اور حسن اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آب کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے۔ زیادہ تامّل نہ کیجئے۔ اس پر آہستہ سے دستخط کیجئے۔ میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا اوہی ندی کے کنارے والا بے مروّت سخت زبان تندمزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظرف میں
اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور
پرستش کی نگاہ سے دیکھا اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر
دیئے۔ الوپی دین فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور انہیں گلے لگا لیا۔''[1]

اس طرح پریم چند نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمیشہ ایمانداری کی جیت ہوتی ہے اور بے ایمانی کی ہار۔ ان کے عموماً افسانوں میں نصیحت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ سماج میں پل رہیں برائیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش نے اصلاحی اور رومانی رنگ کے افسانے لکھے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ''خیالستان وگلستان''، ''محبت ناجنس''، ''نکاح ثانی'' اور ''سودائے سنگین'' افسانے لکھے۔ یلدرم نے اپنے افسانوں کے ذریعے مرد اور عورت کو سماج میں ایسی محبت کا حق دلوانے کا جتن کیا جو حقیقی ہو اور رسم ورواج کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ افسانہ ''سودائے سنگین'' اس کی ایک اچھی مثال ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری نے بھی افسانہ نگاری کی طرف رُخ کیا۔ انہوں نے ترکی اور انگریزی افسانہ نگاروں سے اثر قبول کیا اور اردو افسانہ کے فن کو مالا مال کر دیا۔ ان کے افسانوں میں زبان وبیان کی دلکشی، حسن وعشق کے واقعات خاصی اہمیت کے حامل ہیں
نیاز فتح پوری کا پہلا افسانہ ''گہنا'' جون ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''لٹریچر سے عورت اور اس کا ذکر نکال دینے کے بعد آپ کے پاس
کیا رہ جائیگا۔ کائنات میں کوئی دوسری چیز ایسی ہے جس سے آپ اس کی
رونق قائم رکھ سکیں''[2]

اس کے علاوہ مجنوں گورکھپوری نے ''خواب وخیال''، ''شکست بے صدا''، ''محبت کی قربانیاں''،

---

[1] پریم پچیسی حصہ۔ اول۔ از منشی پریم چند۔ ص ۲۰۷۔ ۲۰۸

[2] کیوپڈ سائیکی۔ از نیاز فتح پوری۔ ص ۲۵

''تم میرے ہو'' وغیرہ افسانے لکھے۔ وہ اپنے افسانے ''خواب وخیال'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''خواب وخیال'' میرا سب سے زیادہ طبع زاد افسانہ ہے۔ یہ چند ایسے صبر آزماں لمحات کی یادگار ہے جبکہ میں موت کی طرف اس کی پوری عریانی اور تاریکی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔''[۱]

اس دور کے حقیقت پسندانہ رجحان کے افسانہ نگاروں میں سدرشن، اعظم کریلوی، علی عباس حسینی اور اوپیندر ناتھ اشک کے نام اہم ہیں۔ انہوں نے سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ دیہاتی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ ان میں پنڈت بدری ناتھ سدرشن کے چھ افسانوی مجموعے ''سدابہار پھول''، ''من کی سوچ''، ''قوسِ قزح''، ''طائر خیال''، ''چشم وچراغ'' ۱۹۳۶ء سے قبل شائع ہوئے اور اعظم کریلوی نے ''ہیرو'' مئی ۱۹۲۹ء، ''ایڈیٹر'' جون ۱۹۲۹ء، ''نشاطِ زندگی'' اکتوبر ۱۹۲۹ء ''بگلا بھگت'' جولائی ۱۹۳۵ء وغیرہ افسانوں میں دیہات کی فطری سادگی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جبکہ علی عباس حسینی نے ''پژمردہ کلیاں'' ۱۹۲۵ء ''میلہ گھومنی'' ''نورونار'' جیسے افسانے اردو ادب کو دیئے۔

ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر افسانوی ادب پر بھی پڑا یہ تحریک ۱۹۳۶ء میں نمودار ہوئی۔ ترقی پسندوں کے افسانوی مجموعہ ''انگارے'' کی اشاعت نے اردو افسانہ نگاری میں تہلکا مچادیا۔ اس میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے ''نیند نہیں آتی''، ''جنّت کی بشارت'' ''گرمیوں کی ایک رات'' ''دلاری'' ''پھر یہ ہنگامہ'' احمد علی کے دو افسانے ''بادل نہیں آئے''، ''آہٹوں کی ایک رات'' محمود الظفر کا ایک افسانہ ''جواں مردی'' اور رشید جہاں کا ایک افسانہ ''دلّی کی سیر'' اور ان کا ہی ایک مختصر ڈراما ''پردے کے پیچھے'' شامل ہیں۔ اس کے بارے میں پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

---

[۱] بحوالہ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل۔ از پروفیسر صغیر افراہیم۔ ص ۱۳۶

''۱۹۳۲ء تک اردو افسانے نے اپنے فنی اور فکری احاطہ کو بڑی حد تک وسیع کرلیا تھا۔ رومانی افسانہ نگار جن کا اسلوب بیان افسانے کے قاری کو وقتی مسرت و انبساط میں مبتلا کیے ہوئے تھا، وہ اب کھلی آنکھوں سے مسائل کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اصلاحی مکتبۂ فکر کے افسانہ نگاروں نے بھی اپنا مبلغانہ اندازِ تخاطب بدلا تھا۔ لیکن ''انگارے'' نامی افسانوی مجموعے کی اشاعت نے فن اور فکر کے اس بدلتے ہوئے رجحان میں شدّت پیدا کردی''[۱]

اس طرح ''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے افسانے کی ہیئت کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں بھی جدت پیدا کی انہوں نے روایتی موضوعات کے بجائے سیاست، انقلاب اور جنس کو موضوع بنایا۔ رشید جہاں نے اپنے افسانوں میں آزادیٔ نسواں پر زور دیا۔ اور احمد علی نے عام انسان کے بنیادی مسائل روٹی کپڑا اور مکان پر قلم اٹھایا۔ اس سلسلے میں وقار عظیم رقمطراز ہیں:

''موضوع کے لحاظ سے اس سے پہلے اردو افسانے میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی کہیں نہیں ملتی''[۲]

ترقی پسند افسانہ نگاروں کے زیر اثر اردو افسانے میں ایک انقلاب برپا ہوگیا اور افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اس انداز کے افسانے لکھ کر زندگی کی ترجمانی کی طرف مائل ہوئی۔ ان میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اوپیندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، احمد علی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی اور اختر انصاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل۔ از پروفیسر صغیر افراہیم۔ ص ۲۰۹

۲۔ نیا افسانہ۔ از وقار عظیم۔ ص ۳۶

کرشن چندر اردو ادب کی دنیا میں ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، ڈرامے، رپورتاژ، انشائیہ لکھے اور کئی کتابیں بھی مرتب کیں۔ انہیں اپنی زندگی میں ہی بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر نے بھی پریم چند کی طرح اپنی کہانیوں کا مواد براہِ راست زندگی سے حاصل کیا شہراور دیہات دونوں کی زندگیوں کا انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اس لیے ان کے افسانوں میں رومانیت کی چھاپ بھی ہے اور حقیقت پسندی کا گہرا رنگ بھی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں طبقاتی نظام کو شدید طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جو غریبوں اور مزدوروں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ کرشن چندر کے اسلوب نگارش کے بارے میں علی سردار جعفری فرماتے ہیں:

> ''سچی بات یہ ہے کہ کرشن چندر کی نثر پر مجھے رشک آتا ہے۔ وہ بے ایمان شاعر ہے جو افسانہ نگار کا روپ دھارن کر کے آتا ہے اور بڑی محفلوں اور مشاعروں میں سب ترقی پسند شاعروں کو شرمندہ کر کے چلا جاتا ہے وہ اپنے ایک ایک جملہ اور فقرے پر غزل کے اشعار کی طرح داد لیتا ہے اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں کہ اچھا ہوا اس ظالم کو مصرع موزوں کرنے کا سلیقہ نہ آیا ورنہ کسی شاعر کو پنپنے نہ دیتا۔''[1]

کرشن چندر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''طلسم خیال'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اور اس کے بعد ''نظارے'' ۱۹۴۰ء ''ہوائی قلع'' ۱۹۴۰ء ''زندگی کے موڑ پر'' ۱۹۴۳ء ''پرانے خدا'' ۱۹۴۴ء ''ان داتا'' ۱۹۴۴ء ''ہم وحشی ہیں'' ۱۹۴۷ء۔ ''آدھے گھنٹے کا خدا'' ۱۹۴۹ء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی نے جنسی موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ منٹو جنس نگار کی حیثیت سے افسانوی دنیا میں مشہور بھی ہوئے اور بدنام بھی ان کے افسانوں پر مقدمے چلے مگر وہ

---

[1] بحوالہ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ از سُنبل نگار۔ ص ۱۶۸

ہر مقدمے میں باعزت بری بھی ہوئے۔ انہوں نے پہلا افسانہ ۱۹۳۴ء میں ''تماشا'' کے عنوان سے لکھا اور یہ افسانہ انہوں نے جلیاں والا باغ کے خونی حادثے سے متاثر ہو کر لکھا اور ''آدم'' کے فرضی نام سے امرتسر کے ایک اخبار ''خلق'' میں شائع کرایا تھا۔ بعد میں یہ افسانہ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''آتش پارے'' کی زینت بنا۔ منٹو اس مجموعہ کے متعلق دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے''[۱]

سعادت حسن منٹو کے افسانوی مجموعوں میں ''آتش پارے'' کے بعد ''منٹو کے افسانے'' ''دھواں'' ''افسانے اور ڈرامے'' ''سڑک کے کنارے'' ''شکاری عورتیں'' ''خالی بوتل خالی ڈبے'' ''لذت سنگ'' ''سیاہ حاشیے'' ''چغد'' ''ٹھنڈا گوشت'' ''بادشاہت کا خاتمہ'' ''یزید'' ''نمرود کی خدائی'' ''اوپر نیچے درمیان'' ''سرکنڈوں کے پیچھے'' ''پھندے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ۱۰۰ ریڈیو یائی ڈرامے ''گنجے فرشتے'' اور ''لاؤڈ اسپیکر'' جیسے خاکے بھی تحریر کئے۔

منٹو کے افسانوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے وارث علوی رقمطراز ہیں:

> ''جنس کی کارفرمائی منٹو کے بیشتر افسانوں میں نظر آتی ہے لیکن اس میں جنس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ کردار کی شخصیت کے دوسرے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کے نیک و بدانجام میں دوسرے جذبات بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً طوائفوں پر اس کی جتنی کہانیاں ہیں ہم انہیں جنسی کہانیاں نہیں کہہ سکتے حالانکہ جنس طوائف کی زندگی اور کردار کا حاوی

۱۔ دیباچہ۔ آتش پارے۔ از سعادت حسن منٹو

جز و اور اس کا پیشہ ہے۔لیکن ان افسانوں کے مرکز میں یا تو مامتا کا جذبہ
ہے، یا بے بسی اور تنہائی کا بے لوث خدمت گزاری کا، یا پھر طوائف کے
کردار کے ایسے پہلوؤں کی آئینہ داری ہے جو اس کی انسانیت اور نسائیت
کو اُجاگر کرتا ہے۔ان افسانوں میں دلچسپی کا مرکز جنس نہیں بلکہ دوسرے
نفسیاتی اور اخلاقی عوامل ہیں۔'' [۱]

راجندر سنگھ بیدی اردو افسانہ نگاری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے خاص طور پر
خارجی و داخلی اور نفسیاتی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔ بیدی نے اپنے ہم عصروں سے آگے بڑھ کر الگ
اندازِ بیان اختیار کیا۔ ان کی پہلی کہانی ''دکھ سکھ'' کے نام سے پنجابی زبان میں چھپی۔ اسکے بعد
اردو میں افسانے لکھنے لگے۔ بیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دانہ و دام'' ۱۹۳۹ء۔ دوسرا مجموعہ ''گرہن
'' ۱۹۴۲ء'' تیسرا'' کوکھ جلی'' ۱۹۴۹ء چوتھا'' اپنے دکھ مجھے دے دو'' ۱۹۴۵ء۔ پانچواں مجموعہ ''ہاتھ
ہمارے قلم ہوئے'' ۱۹۷۴ء میں اور آخری مجموعہ ۱۹۸۲ء میں ''مکتی بودھ'' کے نام سے شائع ہوا۔

بیدی کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''بیدی کہانی لکھتے ہیں، نہ سیاست بگھارتے ہیں، نہ فلسفہ جھاڑتے
ہیں، نہ شاعری کرتے ہیں، نہ موری کے کیڑے گنتے ہیں۔ عام زندگی،
عام لوگ، عام رشتے ان کے افسانوں کے موضوع ہیں۔ ان میں وہ ایسی
طاقت اور توانائی زندگی، تابندی، معنویت اور انفرادیت بھر دیتے ہیں کہ
ذہن میں روشنی ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں سطور سازی اور جنس کی واقعی
اہمیت ہے۔ چھوٹی باتوں کو بیدی افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اور اپنے

---

۱ منٹو ایک مطالعہ۔از وارث علوی۔ص ۶۷

افسانوں میں انہوں نے غریب اور مظلوم طبقے کی حمایت کی مگر اس سے
زیادہ اہمیت زندگی کے وژن کی ہے۔''[۱]

عصمت چغتائی اردو افسانے کی دنیا میں ایک چونکا دینے والا نام ہے۔ جنہوں نے مسلم معاشرے کے لڑکے اور لڑکیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ عصمت چغتائی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کلیاں'' کے عنوان سے ۱۹۴۰ء میں جبکہ ''چوٹیں ۱۹۴۲ء میں ''ایک بات'' ۱۹۴۹ء میں ''چھوئی موئی'' ۱۹۵۲ء میں اور ''دو ہاتھ'' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ عصمت چغتائی کے بارے میں نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی نے ان عورتوں کے بارے میں لکھا جن کی زندگی ادھوری ہے۔ بلکہ ناکام ہے جو چار دیواری میں ہیں جن کی ساری عمر آنگنوں اور دالانوں میں گزر جاتی تھی۔ جنہوں نے ساری عمر چھوئی موئی کی طرح گزاری کسی غیر مرد سے بات تک نہ کی وہ ان کی افسانہ نویس تھیں۔''[۲]

نورالحسن نقوی عصمت چغتائی کے بارے میں مزید رقمطراز ہیں:

''ان (عصمت چغتائی) کی ایک جانی مانی دنیا ہے متوسط مسلمان گھرانوں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دنیا۔ وہ ایسی دنیا میں سیر کرتی اور اپنے قارئین کو کراتی ہیں۔ مگر ان کا فن اتنا پختہ ہے کہ پڑھنے والے کو مصنفہ کی تنگ دامانی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محدود دنیا کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کرتی ہیں۔ اس کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ کرتی ہیں اور تحقیق کے فنّی حسن سے قاری کو موہ لیتی ہیں۔''[۳]

اوپندر ناتھ اشک نے بھی نچلے متوسط طبقے کی معاشی سماجی اور جنسی ناہمواریوں کی تصویر کشی کی

---

۱ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ از سنبل نگار۔ ص ۱۷۰
۲ تاریخ ادب اردو۔ مرتب نورالحسن نقوی۔ ص ۳۳۰
۳ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ از سنبل نگار۔ ص ۱۹۲۔۱۹۳

ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''نورتن'' ۱۹۳۰ء ''ڈاچی'' ۱۹۳۳ء ''ناسور'' ۱۹۳۹ء ''کونپل'' ۱۹۴۰ـ ''چٹان'' ۱۹۴۴ء وغیرہ ہیں۔

احمد ندیم ترقی پسندی کے دور کے ایک اہم اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں پنجاب کی زندگی کے دلکش مرقع پیش کئے۔ان کی نظر سماجی حقائق پر رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں ''چوپال'' اور'' بگولے'' کے افسانوں میں انہوں نے دیہی زندگی کی اونچ نیچ کے مسائل پیش کئے ہیں۔ وہاں ان کے رومانی مزاج اور شاعرانہ میلانات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

تقسیم وطن کے بعد قرۃ العین حیدر، غلام عباس، بلونت سنگھ، شوکت صدیقی اور انتظار حسین نے اپنے فکر وشعور سے اردو افسانے میں نئی راہیں کھول دیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے زمانے کے افسانہ نگاروں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے افسانوں کے علاوہ ضخیم ناولوں کے ساتھ ساتھ ناولٹ، بچوں کے لیے روسی کہانیاں اور کئی کتابوں کے تراجم بھی اردو ادب کو دیئے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول اور افسانوں کے ذریعہ ہند آریائی تہذیب سے لے کر جاگیردارانہ نظام تک اور آزادی کے بعد عالمی سطح پر پیش آنے والے مسائل کی ادبی نقطۂ نظر سے ترجمانی کی ہے۔

انہوں نے ملک کے بدلتے ہوئے منظرنامے کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ پیش کیا۔ قرۃ العین حیدر کو غالبؔ ایوارڈ (۱۹۷۵ء) سوویت نہرو ایوارڈ (۱۹۷۵) پدم شری (۱۹۷۶ء) مخدوم لٹریری ایوارڈ (۱۹۸۱) اور اقبال سمّان ایوارڈ (۱۹۸۹ء) اپنی زندگی میں ہی حاصل ہوئے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے عام طور پر عورتوں کے مسائل سے متعلق ہیں۔ ان کے افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ قرۃ العین حیدر نے عورتوں کو کائناتی مسائل کا ایک حصہ بنا کر دیکھا ہے۔عورت یہاں عورت نہیں رہ گئی، بلکہ ایک وسیع تر مخلوقات کی جزو ہے۔ پوری انسانی زندگی کی اکائی ہے جو وقت کا شکار بھی ہے اور شکاری بھی۔ ان کے افسانوں میں یہی عورت ممد باغ کلب سے لے کر ہوائی اڈوں اور لندن کی محفلوں، ایران اور ترکی کی راہ گزاروں میں ایک نامعلوم سے مبہم درد کے ساتھ بھٹکتی نظر آتی ہے۔''[۱]

''جلاوطن'' قرۃ العین حیدر کا اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ انہوں نے فسادات سے متاثر ہو کر لکھا۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے مطبوعہ ہیں۔ جن میں ''ستاروں سے آگے'' ''شیشے کا گھر'' ''پتجھڑ کی آواز'' ''روشنی کی رفتار'' اور ''جگنوؤں کی دنیا'' شامل ہیں۔

غرض قرۃ العین حیدر نے اردو افسانے کو بہت کچھ دیا۔ سعادت حسن منٹو اور بیدی کے بعد کسی فنکار کا نام لیا جا سکتا ہے، وہ قرۃ العین حیدر ہی ہیں۔

اس کے علاوہ عزیز احمد کے افسانے ''کالی رات'' اور ''میرا دشمن میرا بھائی'' حیات اللہ انصاری کا ''شکر گزار آنکھیں'' قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا'' انتظار حسین کا ''گلی کوچے، وغیرہ قابل توجہ ہیں۔

مسیح الحسن رضوی کے افسانوں میں حکومت برطانیہ کے تاریکِ عہد ہندوستان کی جدوجہد آزادی، دوسری عالمی جنگ اور اسکی ہولناکیاں، دم توڑتے جاگیرداری نظام، ملک کی آزادی، گاندھی جی کی شہادت، تقسیم ملک کے المیے، تقسیم ملک کے بعد فرقہ وارانہ فسادات، زمینداری کے خاتمے سے پیدا شدہ حالات خلائی تسخیر، آزادیٔ وطن کے بعد سیاسی، تہذیبی، سماجی اور معاشی مسائل و موضوعات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر ہر پہلو کو مدنظر رکھ کر افسانے لکھتے

---

[۱] بحوالہ ''قرۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار''۔ مطبوعہ ماہنامہ کتاب نما۔ اکتوبر ۲۰۰۷۔ ص ۳۹

ہیں اگر چہ ان کی ادبی سرگرمیاں نصف صدی پر محیط ہیں لیکن ان کے محض دو ہی افسانوی مجموعے ''چوتھی بہن'' ۱۹۵۶ء میں اور ''تلوے کے کانٹے'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے۔

شرون کمار نے بھی افسانہ کے فن میں اپنی قلم سے جادو جگایا ہے۔ وہ جدیدیوں کی طرح ذات کے حصار میں نہیں رہے بلکہ اردگرد کے ماحول کا گہری نگاہ سے جائزہ لیتے رہے۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع، فن کی پختگی ہے ان کے افسانوں کے مجموعہ ''دل دریا'' ۱۹۸۶ء ''جاگتے رہو'' ۱۹۹۶ء ''جنگل'' ۲۰۰۱ء ''راگ رام کلی'' ۲۰۰۷ء وغیرہ شائع ہوئے۔

عصرِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں کشمیری لال ذاکر کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے زیادہ تر کہانیوں میں کشمیر کے مسائل، ملک کے بٹوارے سے پیدا شدہ حالات، ہندوستانی معاشرے کی زبوں حالی، قومی یکجہتی میں گراوٹ، عورتوں کے حقوق کی پامالی، بچوں کی مزدوری، بیگار، جہیز کی لعنت اور گردوپیش کے ہنگامی حالات پر خاص طور سے توجہ ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''بیریوں والا فقیر'' ۱۹۸۴ء ''اس صدی کا آخری گرہن'' ۱۹۹۴ء ''چنار چنار چہرے'' ۱۹۹۴ء ''برف دھوپ چنار'' ۲۰۰۵ء ''سمندری ہواؤں کا موسم'' ۲۰۰۵ء ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' ۲۰۰۷ء ''اے ماؤ، بہنو اور بیٹیو'' ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آکر مقبول ہوئے۔

جوگندر پال بھی افسانوی ادب کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے جدید لب ولہجہ اپنا کر، ہجرت کا کرب، بے بسی اور خانہ بدوشی کا غم بغیر کسی غیظ وغضب اور اخلاقی تشدد آمیز رویے کو اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ انہوں نے ہندوستانی معاشرے کے علاوہ افریقی قبائل کی زندگی، غربت اور نسلی امتیاز پر افسانے لکھے ہیں۔ دورِ حاضر میں جوگندر پال کے افسانوی مجموعوں میں ''سلوٹیں'' ۱۹۷۵ء ''بے ارادہ'' ۱۹۸۱ء ''کتھا نگر'' ۱۹۸۶ء ''جوگندر پال کے منتخب افسانے''

۱۹۸۷ء ''کھلا'' ۱۹۸۹ء ''پرندے'' ۱۹۹۱ء ''کھودو بابا کا مقبرہ'' ۱۹۹۴ء ''جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب'' ۱۹۹۶ء ''جوگندر پال کے شہکار افسانے'' ۱۹۹۶ء ''بستیاں'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئے۔

مشرف عالم ذوقی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے افسانے سماجی حقیقت نگاری پر لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مسلمانوں کا پچھڑا پن اور ان کے خلاف سیاسی فتنہ انگیزی، فرقہ واریت، بابری مسجد کا انہدام، دہشت گردی کی سازش جیسے خاص مسائل کو پیش کیا ہے۔

مشرف عالم کے افسانوی مجموعوں میں ''بھوکا اتھوپیا'' ۱۹۹۳ء ''ایک انجام خوف کا ریہرسل'' ''منڈی'' ''غلام بخش اور دیگر کہانیاں'' ۱۹۹۸ء ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے'' ۲۰۰۰ء ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'' ۲۰۰۳ء ''نفرت کے دنوں میں'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئے۔ ان کے افسانے کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس رقمطراز ہیں:

> ''مشرف عالم ذوقی کے یہاں ہم اثر زندگی کے تجربات کا وقیع ذخیرہ ہے۔ ان کا اضطراب، ان کا تخیل حقیقتوں کی قید میں اتر جاتا ہے۔''[۱]

انجم عثمانی کے چار افسانوی مجموعے ''شبِ آشنا'' ۱۹۷۸ء ''سفر در سفر'' ۱۹۸۴ء ''ٹھہرے ہوئے لوگ'' ۱۹۹۸ء اور ''کہیں کچھ کھو گیا ہے'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئے۔ ان کے افسانوں میں ذاتی کرب، نفسیاتی الجھنیں کجرویاں، سماجی مسائل، اقدار کا تنزل، ماضی و روایتوں کی گمشدگی اور جڑوں سے دوری کو موضوع بنایا گیا ہے۔

فیاض رفعت کے افسانوی مجموعوں کے نام ''نئے عہد نامے کے سوغات'' ۱۹۷۵ء ''میرے حصے کا زہر'' ۱۹۹۷ء ''زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی'' ۲۰۰۸ء ''جہانِ دگر'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں اشرافیہ میں بڑھ رہی بے ہودگی، سماجی برائیوں، ہندو مسلم تنازعات، مذہب کے نام پر ہو رہے استحصال وغیرہ کو موضوع بنایا۔

---

۱ بحوالہ سہ ماہی رسالہ تمثیل۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال۔ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء۔ ص ۳۴

عصرِ حاضر کے فسانہ نگاروں میں عبدالصمد کا نام بھی ممتاز و مقبول ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''پس دیوار''، ''بارہ رنگوں والا کمرہ''، ''سیاہ کاغذ کی دھجیاں''، ''میوزیکل چیئرس''، ''آگ کے اندر راکھ''، ''بہ قلم خود'' منظر عام پر آئے۔

طارق چھتاری کے یہاں گنگا جمنی تہذیب ملتی ہے۔ ان کے افسانے ''لکیر'' میں ایک مسلم لڑکا کرشن کا رول کرتے کرتے اسی میں کھو جاتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں قومی یکجہتی اور آپسی میل جول کے قائل ہیں۔

سید محمد اشرف افسانہ نگاری کے میدان میں ایک اہم نام ہے ان کا افسانہ ''قدیم معبودوں کا محافظ'' تاریخی نوعیت کا ہے کہ ان کھنڈرات کو دیکھ کر بھی بنی نوع انسان عبرت حاصل نہیں کرتا۔ افسانے میں بابری مسجد کا ذکر بھی آتا ہے۔

حسین الحق کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے ہیں جن میں ''پس پردۂ شب'' ۱۹۸۱ء ''صورتِ حال'' ۱۹۸۲ء ''بارش میں گھرا مکان'' ۱۹۸۶ء ''گھنے جنگلوں میں'' ۱۹۸۹ء ''سوئی کی نوک پر رکا لمحہ'' ۱۹۹۷ء وغیرہ شائع ہوئے۔

سلام بن رزاق افسانے کی دنیا میں ایک اہم نام ہے وہ خاص طور سے نفسیاتی حقیقت نگار ہیں۔ اور اپنے افسانوں میں علامتوں کا بھی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' ۱۹۷۷ء ''معبّر'' ۱۹۸۷ء ''شکستہ بتوں کے درمیان'' ۲۰۰۳ء اور ''زندگی افسانہ نہیں'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئے۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں علی امام نقوی (مرحوم) کے پانچ افسانوی مجموعے ''نئے مکان کا دیمک'' ۱۹۸۰ء ''مباہلہ'' ۱۹۸۸ء گھٹتے بڑھتے سائے'' ۱۹۹۳ء ''موسم عذابوں کا'' ۱۹۹۸ء اور ''کہی ان کہی'' ۲۰۰۰ء میں

شائع ہوئے۔قاضی مشتاق احمد کے افسانوی مجموعے ''صحبت کی خوشبو'' ''درد کی زبان'' ''وفا کے رنگ'' ''لکشمن ریکھا پار'' ''خواب بھی بکتے ہیں'' ''تتلیاں آزاد ہیں'' شائع ہوئے ہیں۔

احمد شاہی کا افسانوی مجموعہ ''لاوا'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ انہوں نے دورِ حاضر کے سماجی اور سیاسی سیاق وسباق میں خوبصورت افسانے لکھے ہیں۔ اور اپنے افسانوں میں علامتوں کا استعمال بھی خوبصورتی سے کیا ہے۔

شاہد اختر کا افسانوی مجموعہ ''برف پر ننگے پاؤں'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا جس میں جنسی کجرویوں، اخلاقی پستی کو موضوع بنا کر منٹو کی روایت کو آگے بڑھایا۔

سلطان سبحانی بھی معاصر افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کو زندگی کی طرح پیش کرتے ہیں۔اس کو فلسفے کی روشنی میں نہیں آنکتے۔

جدید افسانہ نگاروں میں معین الدین عثمانی کا مجموعہ ''نجات'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ان کے افسانوں میں عصری مسائل، نسلی خلیج، سرکاری ظلم وستم، سیاستدانوں کی دورخی وغیرہ کی عکاسی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔مظہر سلیم کا افسانوی مجموعہ ''نیا منظر نامہ'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا ان کے افسانوں میں شہری تناظر، مسلمانوں اور دلتوں کی پامالی، پولس کا ظلم و جبر، متوسط طبقے کی نفسیاتی الجھنیں گھریلو تشدد اور بابری مسجد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

عظیم راہی کے افسانوی مجموعے ''اگلی صدی کے موڑ پر'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ وہ انسانوں کو مسائل کی بھیڑ میں لا کر کھڑا کرتے ہیں اختصار پسندی ان کے افسانوں کی خاص صفت ہے۔

ایم مبین کے افسانوی مجموعوں میں ''ٹوٹے چھت کا مکان'' ۲۰۰۰ء ''نئی صدی کا عذاب'' ۲۰۰۳ء ''زندگی الرٹ'' ۲۰۱۳ء ''لمس'' ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ان کے افسانوں کے موضوعات فرقہ پرستی دہشت گردی، انتظامیہ کی بے رخی اور پولس کی زیادتیاں ہیں۔ان کا قلم غریب، مظلوم اور مجبور لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔

مقدّم حمید کے تین افسانوی مجموعے ''زربیل'' ''ابرکاری'' اور ''جلترنگ'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوچکے ہیں۔ وہ ذاتی شعور اور اجتماعی شعور دونوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔

احمد عثمانی کے چار افسانوی مجموعے ''اپنے آپ کا قیدی'' ۱۹۷۵ء ''رات کا منظر'' ۱۹۸۱ء ''اپنی مٹّی'' ۱۹۹۰ء ''قفس'' ۲۰۱۰ء میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ان کے افسانوں میں اختصار پسندی، علامتی اظہار، مقصدیت، رجائیت اور سماجی معنویت ملتی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی فطرت غریبوں کا اپنے خوابوں کا تعاقب کرنا، مزدوروں کا استحصال، اخلاقی قدروں کا زوال اور ہندو کٹر پرستی جیسے موضوعات کو اجاگر کیا ہے۔

وکیل نجیب کے افسانوں کے تین مجموعے ''جنگل کی امانت'' ۱۹۷۶ء ''سنگ ریزے'' ۲۰۰۰ء ''ماں کی بدّ عا'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئے۔

نورالحسنین بھی اردو کے نامور افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔جن کے افسانوی مجموعے ''سمٹتے دائرے'' ''موررقص'' ''تماشائی'' اور ''گھڑی میں اترتی شام'' قابل ذکر ہیں۔ان کی کہانیاں خاص طور سے انسانی نفسیات، حرص ولالچ اور سماجی مجبوریوں کو پیش کرتی ہیں۔

یٰسین احمد کے چار افسانوی مجموعے شائع ہوچکے ہیں ''گمشدہ آدمی'' ''سلاٹر ہاؤس'' یہ کیا جگہ ہے'' اور ''دھار'' ان کے افسانوں کے خاص موضوع نفسیاتی الجھنوں اور شہروں میں انسانی ہمدردی وغیرہ ہیں۔

صغریٰ مہدی کے چار افسانوی مجموعے ''پتھر کا شہزادہ'' ''جو میرے وہ راجہ کے نہیں'' ''پہچان'' اور ''پیش گوئی'' قابلِ ذکر ہیں۔ان کے تمام افسانے عورتوں کے مسائل، سماجی، سیاسی اور معاشی نظریہ پر مبنی ہیں۔

ذکیہ مشہدی حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ وہ موجودہ سماجی نظام کے بہت سارے رویوں کو ماضی کے مقابلے میں تنزل آمیزش سمجھتی ہیں عورتوں کا نفسیاتی مطالعہ، خانگی زندگی کے تعلقات، زندگی کی تلخیاں اور حسرت ویاس کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''پرانے چہرے'' ۱۹۸۴ء ''تاریک راہوں کے مسافر'' ۱۹۹۳ء ''صدائے بازگشت'' ۲۰۰۳ء ''نقشِ ناتمام'' ۲۰۰۸ء اور ''یہ جہان رنگ وبو'' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئے۔

بشیر مالیرکوٹلوی کے بھی تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''قدم قدم دوزخ'' ۱۹۸۷ء ''سلگتے لمحے'' ۱۹۹۹ء اور ''چنگاریاں'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیاتی، جنسی کجرویوں، سماجی ناانصافی، سیاسی بدعنوانی اور پولس کی درندگی جیسے موضوعات پر خوبصورت افسانے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد انصاری کے دو مجموعے ''ہتھیار'' ۲۰۰۴ء اور ''زندگی کی تلاش'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے معاشرے کا بغور مشاہدہ کیا اور اس میں پنپتی ہوئی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کو اپنے افسانوں کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ اور ان کا حل مذہبی تعلیمات یا روایتی قدروں میں تلاش کرتے ہیں۔

سالک جمیل براڑ کا افسانوی مجموعہ ''لمحے'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ ان کے افسانے روایتی انداز میں لکھے گئے ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

موجودہ دور کی خواتین افسانہ نگاروں میں ترنم ریاض کا شمار مشہور ومقبول افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین'' ۱۹۹۸ء ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' ۲۰۰۰ء ''یمبرزل'' ۲۰۰۴ء اور ''مرارختِ سفر'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں

موجودہ دور کے مسائل، سماجی اور سیاسی انتشار، عورت اور مرد کے رشتے اور ان کی ٹوٹ پھوٹ، نسوانی مسائل، تعلیم نسواں اور موجودہ دور میں کشمیر کے المناک حادثات و واقعات کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔

ترنم ریاض کے افسانوی مجموعہ ''ابابلیں لوٹ آئیں گی'' کے فلیپ پر ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

> ''ترنم ریاض ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کا اظہار اور بیانیہ ان کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ مجھے ترنم ریاض کی کہانیوں میں روایت کے بھر پور شعور کے ساتھ تجربہ کا رنگ بھی شامل نظر آتا ہے۔ وہ صورت حال کو کہانی بنانا جانتی ہیں اور اپنے زمانے کے اسلوبیاتی رویوں سے واقفیت کے باعث کسب فیض بھی کرتی ہیں''[۱]

اردو کی اس مایہ ناز ادیبہ کا ۲۰ رمئی ۲۰۲۱ء کورونا وباء کے دوران کورونا سے متاثر ہوکر دہلی میں انتقال ہوا۔

کرشن بیتاب کے دو افسانوی مجموعے ''لمحوں کی داستاں'' اور ''درد کی فصیل'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے ان کی کہانیاں زیادہ تر پنجابی کہانیوں کے اردو ترجمے ہیں جن میں پنجابی معاشرے کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

کشمیر کے افسانہ نگاروں میں نور شاہ کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''بے ثمر سچ'' ۲۰۰۵ء ''آسمان لہو اور پھول'' کافی اہم ہیں۔ ان کے افسانوں میں انقلابات، قوم کے المیے، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور کشمیر کے لوگوں کے دکھ درد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

---

۱ فلیپ۔ابابیلیں لوٹ آئیں گی' از ترنم ریاض

غضنفر کھوکھر کے تین افسانوی مجموعے ’’خوابوں کے اس پار‘‘ ۱۹۹۶ء ’’کانچ کی سلاخ‘‘ ۲۰۰۳ء اور ’’عبرت‘‘ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سرحدی علاقوں میں دہشت کے سائے میں رہنے والوں کے دکھ درد کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے بے گھر، بے زمینی اور خوف و ہراس کے سائے میں پل رہے لوگوں کی زندگی کی عکاسی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ دہشت گردی پر انھوں نے عزم و ہمت سے قلم اٹھایا وہ انہیں کا خاصہ ہے۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں سمیرا حیدر کے دو افسانوی مجموعے ’’کہیں خواب اور کلیاں‘‘ ۱۹۹۸ء اور ’’قرمزی رشتے‘‘ ۲۰۰۴ء میں منظرِ عام پر آ کر مقبول و مشہور ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عشق محبت اور انسانی رشتوں، شکست ریخت کو بیان کیا ہے۔

نگار عظیم کے تین افسانوی مجموعے ’’عکس‘‘، ’’گہن‘‘ اور ’’عمارت‘‘ شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ وہ معاشرے پر گہری نگاہ رکھتی ہیں اور سماج کے مختلف شعبوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں وہ اپنے افسانوں میں تجریدی اور علامتی انداز بھی پیش کرتی ہیں۔

وحشی سعید نے بھی افسانے کی دنیا میں اپنا قلم آزمایا۔ ان کے افسانوی مجموعے ’’سڑک جا رہی ہے‘‘ (دوسرا ایڈیشن) ۲۰۱۴ء ’’کنوارے الفاظ کا جزیرہ‘‘ ۲۰۱۳ء ’’خواب حقیقت‘‘ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کی ابتداء عشق و محبت کی داستانوں سے کی لیکن جدیدیت سے متاثر ہو کر جلد ہی تجریدی و علامتی انداز اختیار کر لیا ہے۔ وہ انسانی وجود کی لاچاری، بے معنویت، موت کے کرب و ادراک اور انسان و انسانیت کی گمشدگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے رہے۔

خالد حسین اپنے افسانوں میں جدیدیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ’’ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں‘‘ ۱۹۸۱ء ’’اشتہاروں والی حویلی‘‘ ۱۹۹۱ء ’’ستی سر کا سورج‘‘ ۲۰۱۱ء اور

''دستِ طلب'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئے۔ بقول خالد حسین:

''میری کہانیوں میں آج کے عہد کا المیہ ہے، ملک کی تقسیم کے زخم ہیں، بڑی طاقتوں کی بے رحم سازشوں کی داستانیں ہیں''[۱]

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی محرومیوں، کسانوں پر ہو رہے ظلم وستم اور طبقاتی استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''ہزاروں غم'' ۲۰۰۱ء اور ''میٹھا زہر'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آئے۔

عصرِ حاضر کے افسانہ نگاروں میں دیپک بدکی کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں میں جغرافیائی رنگا رنگی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ملازمت کی ہے بلکہ سِول اور فوج کا بھی تجربہ حاصل کیا ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات و جنسیات پر افسانے لکھنے کے ساتھ ساتھ عمرانیات سماجیات پر بھی خوبصورت افسانے قلم بند کئے ہیں۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے،۔''ادھورے چہرے'' (تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء) ''چنار کے پنچے'' (دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء ''زیبرا کرسنگ پر کھڑا آدمی'' ۲۰۰۷ء ''ریزہ ریزہ حیات'' ۲۰۱۰ء ''روح کا کرب'' ۲۰۱۵ء اور ایک افسانچوں کا مجموعہ ''مٹھی بھر دھوپ'' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئے۔

جدید افسانہ نگاروں میں شائستہ فاخری کے دو افسانوی مجموعے ''ہرے زخم کی پہچان'' اور ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' قابل ذکر ہیں۔ وہ معاشرے پر کڑی نظر رکھتی ہیں اور نسوانی مسائل پر خاص طور سے توجہ دیتی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے وقت عورتوں پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا بیان وہ اپنے افسانوں میں بڑے دردناک انداز میں کرتی ہیں۔

اردو افسانے پر جب جدیدیت کا غلبہ ہوا تو احمد ہمیش نے ''مکھی'' اور ''ڈریج میں گرا ہوا قلم'' جیسے علامتی افسانے لکھے، سریندر پرکاش نے دیومالائی فارم اختیار کر لیا اور ''رونے کی آواز''

[۱] بحوالہ سہ ماہی رسالہ ''تمثیل''۔ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال۔ ص ۴۰

''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم''، ''بجوکا'' ''بازگوئی'' اور''بن باس'' جیسے علامتی اور اساطیری کہانیاں لکھیں۔ جدید افسانے میں عوض سید کے افسانوں میں ''رات والا اجنبی'' ''جنازہ'' اور ''موزی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی زمانے میں شوکت حیات ہیں انہوں نے (اینٹی اسٹوری) لکھنے کی تحریک شروع کی۔بلراج سین کا نام بھی قابل ذکر ہے۔

افسانوی ادب کے ارتقائی سفر میں بھوپال کے جن افسانہ نگاروں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں کوثر چاند پوری، ابوسعید بزمی، قدوس صہبائی، شاغل فخری، سلمان الارشد، ابراہیم یوسف، مقصود عمرانی، قمر جمالی، اختر جمال، شاہ میر راہی، منظور سروش، جوہر قریشی، مفتی صدیقی، اقبال مجید، نعیم کوثر، مظفر حنفی، کوثر صدیقی، عیسیٰ صدیقی، اطہر صابری، اظہر راہی، اقبال جعفری، شفیقہ فرحت، رضیہ حامد، فرحت جہاں، اقبال مسعود اور علی متقی دسنوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔حالانکہ ان کا تعلق سرزمینِ بھوپال سے ہے۔لیکن انہوں نے کچھ اچھے افسانے بھی لکھے ہیں جس کی وجہ سے اردو افسانے کی تاریخ میں ان کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۸۰ء تک پاکستان کے چند اہم افسانہ نگاروں مثلاً انتظار حسین، غلام ثقلین نقوی، آغا سہیل، یونس جاوید، منیر احمد شیخ، انور سجاد، احمد ہمیش، رشید امجد، خالدہ حسین، زاہدہ حنا، مرزا حامد بیگ، ناصر بغدادی، رخسانہ صولت، مستنصر حسین تارن، اور مشتاق قمر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک آصف فرقی ''دیمک'' ''کالی رات'' طاہر نقوی، سائرہ ہاشمی، خالد سہیل بھی اسی میدان میں سرگرم عمل رہے۔

عام طور پر دیکھا جائے تو آج بھی افسانے کا سفر جاری ہے اور افسانے کی صنف میں نئے نئے تجربے ہورہے ہیں۔ جہاں علامتی افسانہ نگاری نے اردو افسانے کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ وہی ان افسانوں میں عدم تحفظ، تنہائی، بے بسی، بے یقینی، ذات کی گمشدگی اور دنیا میں تنہا ہونے کے

احساس جیسے موضوعات بھی کثرت سے پیش کئے ہیں۔اور اردو افسانوں کو زمانے کے ساتھ چلنے کے قابل بنایا ہے۔

اسی طرح اردو افسانہ کے موضوعات میں بھی وسعت پیدا ہوئی اور نئے افسانے نگاروں نے آج کے سلگتے ہوئے مسائل کو بھی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اور دیگر صنف سخن کی طرح افسانہ بھی روز بروز ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

باب دوم

موجودہ دور میں بھوپال میں اردو افسانے کی صورتِ حال

موجودہ دور میں بھوپال میں اردو افسانے کی صورتِ حال

سرزمین بھوپال زمانۂ قدیم سے اردو زبان اور شعروادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں ہر عہد میں لاتعداد ادباء اور شعراء پیدا ہوتے رہے ہیں کہ اسے شہرِغزل اور بغداد الہند جیسے لقب سے نوازا گیا۔

یہاں کے بیشتر ماہرِ فن شعراء اور ادباء نے اپنی گراں قدر تخلیقات سے اس دبستانِ سرمائے ادب میں بیش بہا اضافے کئے۔ جو ادب پروان چڑھا اس میں قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد کی مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔اس گلشنِ ادب کے رنگارنگ پھولوں کی خوشبو سے معطّر فضا ہی عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں کے لیے معاون ثابت ہوئی اور جو شعروادب تخلیق ہوا اس میں حب الوطنی اور باہمی اتحاد کی چھاپ موجود تھی۔ کیونکہ آزادی کی تحریک کے سبب یہاں کی فضا وطن کی محبت سے سرشار تھی۔ جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو ادیب حقیقت نگاری کے ساتھ زندگی کی سچی ترجمانی کی طرف متوجہ ہوئے اور ادب برائے زندگی کا نظریہ عام ہوا۔ چنانچہ حق گوئی کے ساتھ حقیقی کردار اور سچے انسانی جذبات اور خیالات نے شعروادب پر گہرا اثر ڈالا جس کے نتیجے میں سچّی، پرجوش اور اثر انگیز تحریروں سے اردو ادب کا دامن بھرنے لگا۔

جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے یہاں کے افسانہ نگاروں نے گنگا جمنی تہذیب اور حب الوطنی کو پیش کیا۔ اور ترقی پسند نظریہ اکثر یہاں کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ بھوپال کے لکھنے والوں نے عہدِ قدیم سے رائج مختلف روایتوں اور رجحانات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن یہاں پر ایسے افسانہ نگاروں کی تعداد بہت کم ہے جن کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی ہو یہاں خوش

گوارا اور ساز گار ادبی فضا میں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کو بھی پروان چڑھنے کے پورے مواقع میسر تھے لیکن شاعری کے مقابلے میں افسانے کو یہاں خاطر خواہ فروغ حاصل نہ ہوسکا۔ یہاں ہر دور میں افسانہ نگار پیدا تو ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، سلام بن رزاق نہیں بن سکے۔ اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں:

''یہ عجیب اتفاق ہے کہ بھوپال جو ہمیشہ سے اردو زبان وادب کا گہوارہ اور اردو تہذیب واخلاق کا مسکن رہا ہے اردو کی افسانوی دنیا میں کوئی نمایاں نام پیش نہیں کرسکا ایسا نام جو بھوپال کی پہچان بن جاتا۔ بھوپال کی عظمت کا نشان بن جاتا۔ یہاں افسانہ نگار پیدا تو ہوئے۔ پروان بھی چڑھے لیکن تناور درخت نہیں بن سکے۔ حالانکہ چھوٹے بڑے تالاب، نیچی نیچی پہاڑیاں ندی، نالے، اردگرد گھنے جنگلات، حسین مناظر سہانے موسم کیا کچھ کہانیاں نہیں سناتے ہیں اور کس کس طرح کہانیاں سنانے کے لیے نہیں اکساتے۔ اس کے چھوٹے بڑے تالاب سے نہ جانے کتنی کہانیاں وابستہ ہیں۔ کسی نے جل پری سے اس کا رشتہ جوڑ دیا تھا۔ کسی نے کنول کے پھول سے اس کا تعلق پیدا کردیا تھا اور کوئی گلِ بکاؤلی کا اس میں متلاشی نظر آتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھر ماضی سے حال تک اس کی تاریخ سے لپٹی ہوئی نہ جانے کتنی دل بڑھانے والی، دل جلانے والی، زندہ رہنے کا حوصلہ دینے والی، زندگی کو غمناک بنانے والی، طربناک بنانے والی، اس میں رنگ بھرنے والی کہانیاں سوئی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی قصہ گو انہیں جگاتا ہے تو آج بھی لوگ انہیں بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔۔۔۔۔۔ سانچی کے آثار میں بودھ مذہب کے ماننے والوں کے فکر وفن جھلکتے ہیں۔ صحابیوں کی قبریں تاریخِ پارینہ کی طرف لے جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رانی کملا پتی کا محل، دو قوموں کے اتحاد کی تصویر دکھاتا ہے۔ اسلام نگر کا قلعہ تاریخِ بھوپال کا ایک اہم رقم پیش کرتا ہے۔ قلعہ رائسین درویش صفت بزرگ کی روحانی منزلوں کی فتوحات سے لبریز ہے اور خود

اس ریاست کے نواب، امراء اور جاگیرداروں کی زندگیاں انکی کشمکش، رقابتیں، لڑائیاں، رواداریاں، ان کی محبتیں، ایثار و قربانیاں، ایک خاص تہذیب کے عروج و زوال، ایک خاص معاشرے کی شکست و ریخت کی داستانیں اپنے اندر چھپائے ہوئی ہیں۔ کوئی افسانہ نگار ذرا ہمت کر کے پردہ اٹھائے تو وہ نہ جانے کیسے کیسے کرداروں کو متحرک دیکھے گا۔ کیسے کیسے واقعات کو سر اٹھائے ہوئے محسوس کرے گا۔۔۔۔۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہوا، کسی فنکار کا انتظار پہلے بھی تھا، اب بھی ہے۔ البتہ اب زیادہ شدت سے ہے۔'' [۱]

اس باب میں اُن افسانہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے بھوپال میں افسانے کے فن کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور اچھے اور معیاری افسانے پیش کیے۔

ابتداء میں نیاز فتح پوری نے بھوپال میں رہ کر چند افسانے لکھے اور انہوں نے خود بھوپال کے افسانہ نگار نہ ہوتے ہوئے بھی افسانوی ادب کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اور ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر کچھ تخلیق کار افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ بھوپال میں افسانے کے تعلق سے نیاز فتح پور کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان خاں اپنی کتاب، '' بھوپال میں اردو انضمام کے بعد'' میں رقمطراز ہیں:

''۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۵ء کا دور نیازؔ کی انشائیہ نگاری یا کسی قدر افسانہ نگاری کا زمانہ ہے اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۶ء تک وہ بھوپال میں ہی مقیم رہے ہیں اس لحاظ سے اگر نیاز فتح پوری کو بھوپال میں اردو نثر میں افسانوی طرز اسلوب کا بانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔'' [۲]

یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ نیاز فتح پوری نے بھوپال میں اردو افسانے کا باقاعدہ آغاز کیا اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ نیاز فتح پوری نے بیشتر افسانے بھوپال میں ہی رہ کر تحریر کیے اس حقیقت

---

۱ بھوپال کا ایک افسانہ نگار۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ مطبوعہ کتاب نما۔ دہلی

۲ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۵۹

پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں:

''(نیاز فتح پوری) جس زمانے میں بھوپال کے دفتر تاریخ میں ملازم تھے انھوں نے مندرجہ ذیل کتب تصنیف کی تھیں: (۱) گہوارہ تمدن (۲) صحابیات (۳) مصطفٰے کمال پاشا (۴) تاریخ دولتین (۵) تاریخِ اسلام (۶) نگارستان (کیوپیڈ سائیکی وغیرہ افسانے اسی دور میں لکھے جو بعد میں کتابی صورت میں چھپ گئے۔) (۷) شہاب کی سرگزشت (یہ بھی بعد میں کتابی صورت میں چھپا) یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مولانا کو اپنے زمانے کا زبردست انشاء پرداز اور نقاد بنانے میں بھوپال کا ہاتھ بہت زیادہ ہے۔''[۱]

نیاز فتح پوری اگر چہ محض افسانہ نگار نہیں ہیں۔ لیکن قیام بھوپال کے دوران انھوں نے جو افسانے لکھے وہ افسانوی ادب کی طرف توجہ دلانے میں معاون رہے۔ جو ان کے مخصوص رومانی انداز میں لکھے گئے ہیں۔

ابتدائی عہد کے افسانہ نگاروں میں سب سے اہم اور نمایاں نام علی کوثر چاندپوری کا ہے۔ کوثر چاندپوری نے بھوپال میں تخلیقی ادب تحریر کیا اور یہاں رہ کر مسلسل افسانے، ناول، مضامین اور کتب تحریر کیں۔ جو ہندو پاک کے نامور رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ وہ بھوپال کی ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے اور کافی عرصے مدھیہ پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر رہے۔

کوثر چاندپوری ایک طویل عرصے تک بھوپال میں مقیم رہے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی ان کی بھوپال آمد، قیام اور افسانہ نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

''کوثر صاحب در اصل ''چاندپوری سے زیادہ بھوپالی ہیں ۱۹۱۷ء

---

[۱] بحوالہ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۵۹

میں بھوپال آئے تھے جب کہ بہت کم عمر تھے۔۱۹۲۲ء میں بحیثیت طبیب میڈیکل ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے۔۱۹۵۵ء میں افسر الاطباء کے عہدے سے رٹائر ہوئے اور اب اپنا ذاتی مطب چلا رہے ہیں۔کوثر صاحب کی ادبی تربیت اور شہرت بھوپال ہی کی مرہون منت ہے۔ان کی جتنی کتابیں شائع ہوئیں وہ سب بھوپال کی تخلیقات ہیں ابتدائی زمانے میں کوثر صاحب نے بعض مشہور طبی کتابیں اردو میں تالیف کیں جس نے ان کا تعارف طبقہ حکما میں کرایا۔ ۱۹۲۵ء سے افسانے لکھ رہے ہیں اور اس کثرت سے لکھنے کے عادی ہیں کہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا فطرت ثانیہ بن چکا ہے۔''[1]

کوثر چاندپوری کی ابتدائی دور کی کہانیوں میں عشق اور محبت کے قصّے بھی ہیں۔ان کے افسانوں کے موضوعات میں حق پسندی، آپسی بھائی چارے اور انسان دوستی کو اہمیت حاصل ہے۔طبقاتی کشمکش اور انسانی زندگی کے مختلف مسائل کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔

ڈاکٹر محمد نعمان خان کے مطابق بھوپال میں قیام کے دوران کوثر چاندپوری کے تحریر کردہ افسانوں کے درج ذیل مجموعے مطبوعہ ہیں:

(۱) دلگداز افسانے۔مکتبہ جدید لاہور ۱۹۲۹ء۔(اقبال لائبریری بھوپال ہے۔)

(۲) دنیا کی حور۔(آسی پریس لکھنؤ) ۱۹۳۰ء

(۳) ماہ وانجم (عالمگیر بک ڈپو لاہور) ۱۹۳۷ء

(۴) دلچسپ افسانے (جامعہ پریس، دہلی) ۱۹۳۸ء

(۵) دنیا کی حور اور دوسرے افسانے (مکتبہ جدید، لاہور) ۱۹۳۸ء

---

[1] اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ۔از ڈاکٹر سلیم حامد رضوی۔ص ۴۴۶

(۶)	گل ولالہ (انواراحمدی پریس الہ آباد) ۱۹۳۸ء

(۷)	شب ناچے (انواراحمدی پریس الہ آباد) ۱۹۴۱ء

(۸)	عورتوں کے افسانے (مکتبہ جدید۔ لاہور) ۱۹۴۱ء

(۹)	رنگین سپنے (نفیس بکڈ پو، حیدرآباد) ۱۹۴۱ء

(۱۰)	لیل ونہار (فسانۂ عجائب، جدید افسانوی لباس میں) (انواراحمدی پریس، الہ آباد) ۱۹۴۴ء

(۱۱)	اشک وشرر (دارالبلاغ، لاہور) ۱۹۴۴ء

(۱۲)	شعلۂ سنگ (ہمدرد اکادمی، کراچی ۱۹۶۳ء) [۱]

کوثر چاند پوری کے زیادہ تر افسانے روایتی اور بیانیہ انداز کے ہیں۔ بھوپال کے ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں کوثر چاند پوری ہی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے استقامت کے ساتھ افسانے تحریر کئے۔ ان کے زیادہ تر افسانے اصلاحی اور تعمیری خیالات پر مبنی ہیں۔

ابتداً نثر کے میدان میں ان کی خدمات بہت ہمہ جہت ہیں انہوں نے ابتداً طبّی معلومات سے بھرپور مضامین اور انشائیہ لکھے۔ خاکہ، طنز ومزاح اور تاریخی مضامین بھی کامیابی کے ساتھ لکھتے رہے۔ لیکن جس صنف نے انہیں شہرت اور مقبولیت دلائی وہ افسانہ نگاری ہے۔ کوثر چاند پوری بہترین افسانہ نگار تھے۔ وہ افسانہ کس مقصد سے اور کن افکار کے ماتحت لکھتے تھے اس کا اظہار انہوں نے افسانوں کے مجموعے ''دلگداز افسانے'' میں اس طرح کیا ہے:

> ''ہمارا منشاء افسانہ نگاری سے صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ایک بہترین اخلاقی روح کو حسن وعشق کے ساتھ ملا کر ایسے اعتدال تک پہونچا دیں کہ اول الذکر کی ''جدت وحرارت'' ہماری کمزوریوں کو جلا کر فنا کردے۔

---

[۱] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۶۲۔۱۶۳

ہمارے حواس میں ایک ایسی ضیاء اور تنویر پیدا کردے کہ ہم دنیا کے ہر اندھیرے کو اس کی امداد سے طے کر جائیں۔ یہ مقصد اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ہم ان سب اجزاء کے اوزان اور تناسب کا لحاظ رکھیں اگر اس تناسب پر نظر نہ رکھی جائیگی تو یقیناً ہماری اصل غرض فوت ہو جائیگی اور ہم اپنے مقصد اصلی سے دور جا پڑیں گے۔''[۱]

کوثر چاند پوری کے زیادہ افسانوں کے موضوعات دیہاتی زندگی اور سماجی مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں میں انسانی نفسیات اور جذبات کی بھرپور عکاسی اور حقیقت نگاری متاثر کرتی ہے۔انہوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ یہی خوبی ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے کوثر چاند پوری کے افسانوں کے کردار عام طور پر مخلص اور ہمدرد انسان ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان وطرز بیان بہت سادہ اور دلکش ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ عورتوں کی معاشرتی زندگی اور نفسیاتی کرب کو بھی ظاہر کرتے ہیں جس سے عورتوں کو خود اعتمادی اور صبر وتحمل کا درس بخوبی ملتا ہے۔

بھوپال میں خواتین کی ایک طویل عرصے تک حکومت رہی اسی وجہ سے بھوپال کے ادب میں پاکیزگی، پردہ داری، سادگی اور شائستگی عام طور پر ملحوظ رکھی جاتی تھی۔اس روایت کو کوثر چاند پوری نے بڑی سنجیدگی سے قائم رکھا۔اور اس روِش کو آئندہ لکھنے والوں نے بھی برتا۔

کوثر چاند پوری کے افسانے ہندو پاک کے معیاری اور ادبی رسائل میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔جن میں کئی افسانے اب دستیاب نہیں ہیں لیکن جو افسانے دستیاب ہیں ان کے مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوثر چاند پوری ایک بہترین افسانہ نگار تھے۔اگر چہ ان کے کئی

---

۱ دلگداز افسانے۔از کوثر چاند پوری۔ص ۶

افسانوں کے موضوعات روایتی ہیں۔ کچھ افسانوں میں دلچسپی اور تاثر کی کمی بھی ہے لیکن یہ بات سبھی افسانوں میں نہیں ہے۔ کچھ افسانے بہت پراثر اور معیاری ہیں۔

کوثر چاندپوری نے بھوپال میں رہ کر اردو ادب کی جو خدمات انجام دیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ارجمند بانو افشاںؔ اپنی کتاب ''ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو'' میں لکھتی ہیں:

> ''کوثر چاندپوری کا تعلق بھوپال سے بے حد گہرا اور دیرپا رہا ان کی تصانیف کا زیادہ تر حصہ یہیں وجود میں آیا اور یہیں طبع ہوا۔ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں بھوپال سے ماہنامہ ''جادہ'' نکالا جس نے زبردست مقبولیت حاصل کی لیکن ملک تقسیم ہونے کے بعد یہ ماہنامہ بند ہوگیا۔ کوثر کی تخلیقات میں ادب برائے زندگی کا ترقی پسند نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ ادب کو زندگی کا حقیقی ترجمان بنایا اور نہ صرف سماج کی برائیوں کو پیش کیا بلکہ انہیں دور کرنے کا راستہ بھی دکھایا بحیثیت نقاد بھی ان کا درجہ کافی بلند ہے ان کے مختصر افسانے مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھی ہیں ان کی تاریخی کتب میں ''جامِ جم'' بیرم خان ترکمان'' اور ''اطبائے عہد'' مطبوعہ ہیں۔ مزاحیہ تخلیقات میں ''نوک جھونک''، ''شیخ جی'' ''موجِ کوثر'' اور ''مسکراہٹیں'' کافی اہم ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''کوثرستان'' کے نام سے طبع ہوا۔ ان کے ناول ''ویرانہ''، ''اغوا''، ''سب کی بیوی''، ''پیاسی جوانی'' اور دو زنجیریں'' کافی مقبول ہوئے۔''[1]

---

[1] ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو۔ از پروفیسر ارجمند بانو افشاںؔ۔ ص ۲۶۳

نیاز فتح پوری اور کوثر چاند پور کے بعد علاّمہ محوی صدیقی کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے انہوں نے بہت زیادہ افسانے نہیں لکھے ہیں لیکن نوجوانوں اور بچوں کے لیے سادہ اور سلیس زبان میں اصلاحی کہانیاں لکھیں ہیں۔

بھوپال کے نثر نگاروں میں ایک اور نام ابوسعید بزمی کا ہے۔ جنہوں نے صحافت میں زیادہ زور صرف کیا۔ لیکن افسانہ نگاری پر بھی ان کی توجہ رہی ان کا افسانوی مجموعہ ''زندگی کے جائزے'' کے ۱۹۴۶ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ان کے زیادہ تر افسانے حقیقت نگاری پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے اکثر افسانوں میں افسانویت میں کمی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ابوسعدی بزمی خود لکھتے ہیں:

> ''ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ تو مصنف کے تخیل کی پرواز کا نتیجہ ہے اور نہ عشق ورومان کی خیالی دنیا سے انہیں کوئی واسطہ ہے، نہ میں نے معیاری زندگی پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ واعظ ناصح کی طرح زندگی کی کسی خاص راہ کی طرف دعوت دینے کا بہروپ بھرا ہے اس کے برعکس یہ ایک عینی گواہ کی شہادت ہے جس نے زندگی کے بعض دل میں چبھ جانے والے پہلو دیکھے اور ان کو فراموش نہ کر سکا۔ ان میں جو کچھ بھی ہے، زندگی کی حقیقی تصویر ہے جس کا مشاہدہ مصنف نے مختلف اوقات میں کیا ہے۔ اس لیے اگر کسی افسانہ میں آپ کو اخلاقی پہلو نظر نہ آئے یا پلاٹ گٹھاؤ اور واقعات کے اتار چڑھاؤ میں کوئی کمزوری محسوس ہو تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں، میں نے جیسا پایا ویسا پیش کر دیا۔ میں نے واقعات میں کوئی تحریف نہیں کی، البتہ نام اور مقام سب فرضی ہیں''۔[۱]

---

۱ ''گذارش''۔ ''زندگی کے جائزے''۔ از ابوسعید بزمی۔

بھوپال کے افسانہ نگاروں میں قدوس صہبائی کا نام بھی اہم ہے۔ اگرچہ وہ ایک کامیاب صحافی تھےلیکن انہوں نے افسانہ نگاری پر بھی توجہ کی۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''کروٹیں''، ''زلزلے'' ''اندھیرے''، ''نئے خاکے'' (افسانچے) ''چھالے''، ''سات کنوارے''، ''منتخب افسانے'' اور ''پریم پجارن'' وغیرہ شائع ہوئے۔

قدوس صہبائی ابتداء سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اپنے افسانوں میں ترقی پسند نظریات کو پیش کیا۔ ان کے افسانے اور ناول ''نئے انسان'' ۱۹۴۸ء میں طبع ہوئے۔ ایک غیر مطبوعہ ''بڑے لوگ'' یادگار چھوڑا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر محمد نعمان خان نے اپنی کتاب ''بھوپال میں اردو انضمام کے بعد'' میں (ص ۱۶۶) پر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بے بس لوگوں کی مجبوریاں، سماجی مسائل، زندگی کی حقیقتوں اور رجعت پسندی کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے مغربی افسانہ نگار موپاساں کے افسانوں کا ترجمہ اردو میں آسان زبان میں کیا ہے۔ بعد میں یہ تمام تراجم ''ولولے'' کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

ملک میں جب ترقی پسند ادبی تحریک رونما ہوئی تو اس کا اثر بھوپال کے افسانہ نگاروں پر بھی ہوا۔ جن افسانہ نگاروں نے اس تحریک سے متاثر ہوکر افسانے تحریر کئے ان کے نام درج ذیل ہیں:

''شاغل فخری، سلمان الارشد، ابراہیم یوسف، مقصود عمرانی (آفاق مسعود) عنبر چغتائی، کوکب جمیل، ظہور نشتر، شہاب مالوی، اے آر رُشدی، قمر جمالی، اختر جمال، شاہ میر راہی، انجم عثمانی، منظور سروش، جوہر قریشی اور مفتی صدیق وغیرہ۔

سلمان الارشد نے افسانہ نگاری اور صحافت کا آغاز بھوپال میں کیا اور بعد میں وہ پاکستان چلے گئے وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''تصورات'' ۱۹۳۹ء میں عتیق الرحمٰن نے بھوپال سے شائع کیا جو (۵۰) صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۷، افسانے شامل ہیں جس کا

مقدمہ قدوس صہبائی اور تعارف احمد سبزواری نے تحریر کیا۔ اور اس میں احسان دانش، مولانا آزاد انصاری، راجہ مہدی علی خاں کی آراء بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد نعمان خاں کے مطابق احسان دانش نے اس مجموعے کے بارے میں اپنے خیالات اس طرح پیش کئے ہیں:

''سلمان الارشد کے افسانوں میں اس کے دل کا وہ دھواں محسوس ہوتا ہے جو بلند ہو کر روشن ہو جاتا ہے۔''[1]

سلمان ارشد کے افسانوی مجموعے تصورات کے علاوہ ''سوزِ حیات'' ''ناسور'' اور ''جھوٹے سپنے'' کے عنوان سے افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ان کے افسانے اپنے عہد کے مشہور ومعروف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

سلمان الارشد کے مجموعے ''سوز حیات'' میں گیارہ (۱۱) رومانوی افسانے شامل ہیں۔ اسے عتیق الرحمٰن نے ۱۹۴۴ء میں بھوپال سے شائع کیا۔ ان کا تیسرا مجموعہ ''ناسور'' بمبئی سے شائع ہوا جس میں ۱۱۹فسانے کچھ حد تک سیاسی موضوعات پر ہیں۔ ان کا چوتھا مجموعہ ''جھوٹے سپنے'' ہے۔

سلمان الارشد کے افسانوں کی ٹیکنیک کہیں بیانیہ ہے اور کہیں کہیں خود کلامی سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے افسانوں میں اس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کی ترجمانی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وطن کی محبت، وطن کو آزاد کرانے کی شدید خواہش، طبقاتی نظام کے نقصان کے اثرات اور پسماندہ طبقے کے مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔

قمر جمالی نے بھی کافی تعداد میں افسانے لکھے ہیں ان کے افسانوی مجموعے ''شبیہہ'' ۱۹۹۰ء ''سبوچہ'' ۱۹۹۲ء ''سحاب'' ۲۰۰۰ء اور ''زہاب'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی، سیاسی، قومی یکجہتی کی بگڑتی صورت اور انسانی کرداروں میں خیر وشر کے تصادم پر

---

[1] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۶۷

خوبصورتی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے افسانوں میں تصوف کی جھلک بھی ہمیں متاثر کرتی ہے۔

بھوپال کے افسانہ نگاروں کی صف میں عنبر چغتائی نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر چہ ان کا کوئی افسانہ مطبوعہ نہیں مل سکا۔ لیکن اکثر بھوپال کی ادبی تاریخی کتابوں میں بحثیت افسانہ نگار ان کا ذکر ملتا ہے۔

کوکب جمیل کا ذکر بھوپال کے ابتدائی ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فہرست میں ہے۔ ان کے افسانے جن رسائل واخبارات میں شائع ہونے کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد نعمان خاں رقمطراز ہیں:

> ''آئینہ'' بمبئی''، ''کامیاب'' دہلی، ''نگارستان''، ''عصر جدید'' کلکتہ، ''نقاش''، ''ضرب کلیم''، ''نیرنگ خیال''، ''جادہ'' بھوپال، ''افکار'' بھوپال وغیرہ رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔''[1]

کوکب جمیل نے آزادی کے بعد بدلتی ہوئی سماجی قدروں اور تقاضوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانیت کی فلاح اور بہبود کا جذبہ اور بدلتے ہوئے وقت کے سنجیدہ مسائل ہیں۔

اے۔ آر۔ رشدی کا خاص میدان صحافت ہے۔ لیکن انہوں نے مضامین اور مقالات کے علاوہ اصلاحی یا معلوماتی نوعیت کے کچھ افسانے بھی تحریر کئے ہیں جن میں افسانیت کم اور علمیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے کچھ انگریزی افسانوں کے ترجمے اردو میں کئے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سازِ برگ'' کے نام سے شائع ہوا۔

سید ذوالفقار الحق نے بھوپال میں رہ کر دو افسانوی مجموعے تحریر کئے ہیں۔ پہلا ''راز کی باتیں'' جس میں مزاحیہ افسانے ہیں اور دوسرا مجموعہ ''سیاروں سے آگے'' جو سائنٹفک معلومات پر مشتمل ہے۔ ان کے افسانے، افسانے کے فن کی کسوٹی پر کھرے نہیں اُترتے۔

---

[1] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۶۹

سعید بھوپالی کا افسانوی مجموعہ ''دوزخ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ مقصود عمرانی نے بھی ابتداء میں آفاق مسعود کے نام کے کچھ افسانے لکھے۔

ابراہیم یوسف نے تحقیقی، تنقیدی مضامین کے علاوہ ایک ناول اور ایک افسانہ ''فاختہ'' بھی لکھا جس میں انہوں نے کالج کے ماحول کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ اس افسانے میں امیر گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طلباء کی نفسیات کو طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

شاہ میر راہی کا شمار بھوپال کے کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاری کا آغاز کیا ان کے افسانوں کا مجموعہ ''نئے راستے'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ شاہ میر راہی نے اپنے افسانوں کے ذریعہ گاؤں میں رہنے والوں کی زندگی کے مسائل، آپسی بھائی چارہ، انسانی ہمدردی، بے روزگاری اور فرقہ وارانہ فسادات سے ہونے والے نقصانات کو پیش کیا ہے۔ ان کی زبان اور اسلوب موضوع سے میل کھاتا ہے۔

شاہ میر راہی افسانہ ''تم ہندو ہو'' میں فسادات کی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے اور مذہب کے نام پر ہونے والے فسادات کے خلاف افسانے کے ہیرو ''رامو'' کی زبان سے اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جو الفاظ ادا کروائے ہیں:

> ''بھائی دَھرم ہمیں تباہ کردے گا۔ دھرم ہم نے پیدا کیا ہے۔ ہم اسے مٹا بھی سکتے ہیں لیکن آؤ ہم ایک الگ سنسار بنائیں، جہاں پریم ہو، ان لُٹے ہوئے انسانوں سے پوچھو کہ آج ان کے مندروں کے گھنٹے کیوں نہیں بجتے، آج ان کی مسجدوں سے کیوں اذانوں کی آوازیں نہیں آتیں، آج دیوتا کہاں اپنا منھ چھپائے بیٹھے ہیں۔''[۱]

شاہ میر راہی نے اصلاحی اور نفسیاتی افسانے بھی تحریر کئے۔ وہ اپنے افسانوں میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں اس سلسلے میں رام بلاس شرما رقمطراز ہیں:

۱؎ نئے راستے۔ از شاہ میر راہی۔ ص ۶۷

''شاہ میر راہی نئے زمانے کے ایک باشعور افسانہ نگار ہیں۔''نئے راستے''میں انہونے وہ مسئلے لیے ہیں جو آج کل عوام کے سامنے ہیں۔نئی زندگی کے لیے عوام کی جدوجہد میں وہ غیر جانب دار ہیں۔ان کے کردار زندگی سے لئے گئے ہیں۔اسی لیے ان کے فن میں تازگی اور اثر ہے۔''[۱]

شاہ میر راہی میں ایک اچھے افسانہ نگاری کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ اگر اس جانب وہ استقامت کے ساتھ قدم بڑھاتے تو ملک کے مشہور افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوسکتا تھا۔

ریاست بھوپال میں اردو افسانہ آزادی سے قبل ارتقاء کی کئی منازل طے کر چکا تھا۔کوثر چاندپوری، قدوس صہبائی اور اختر جمال وغیرہ بحثیت افسانہ نگار ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔بھوپال میں آزادی کے بعد ایسے افسانہ نگار ملتے ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں سے اس گلشنِ ادب کی آبیاری کی۔اس عہد کے افسانوں کے موضوعات اور اسالیب پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں:

''۱۹۵۰ء کے آس پاس اردو افسانے میں نئے تبدیل شدہ حالات کی وجہ سے ایک نیا موڑ آیا اور یہ صنف جدید تعلیم سے آراستہ افراد کے ہاتھوں میں آگئی جس کی وجہ سے اس میں نئے حالات واقدار کی روشنی میں کچھ نئے تجربات بھی ہوئے۔حصول آزادی کے بعد تقسیم وطن، جمہوری نظام حکومت کا قیام، فسادات، سیاسی کشمکش اور دیگر عوامی مسائل نے اردو افسانہ کو زندگی اور سماج سے مزید قریب کر دیا۔ چنانچہ اب اس میں نہ تو خالص رومانیت تھی، نہ تصور پرستی، نہ جانب داری اور نعرہ بازی اور نہ ہی طوالت و یکسانیت کا عیب''۔[۲]

آزادی کے بعد بھوپال میں جن افسانہ نگاروں نے خصوصی طور پر افسانہ نگاری پر توجہ کی ان

---

[۱] نئے راستے۔از شاہ میر راہی۔ص ۱۱

[۲] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ص ۱۷۴

میں نعیم کوثر، آفاق احمد، اطہر صابری، عیسیٰ صدیقی، شمیم احمد، مظفر حنفی، اظہر راہی، شفیقہ فرحت، قیوم جاوید، اقبال جعفری، گھنشیام تومر، منان سلیم، اقبال مسعود، مختار شمیم، رضیہ حامد، فرحت جہاں، خالد عابدی، سکندری ضمیر، کوثر صدیقی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

بھوپال کے افسانہ نگاروں میں مظفر حنفی بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء ۱۹۵۰ء کے آس پاس افسانہ نگاری سے کی ان کے افسانوں کے تین مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ انکا پہلا مجموعہ ''اینٹ کا جواب'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا اس میں کل ۲۱ افسانے شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ ''دوغنڈے'' ۱۲؍افسانوں پر مشتمل ہے۔ جو نومبر ۱۹۶۹ میں نصرت پبلیکیشن لکھنؤ سے شائع ہوا اور تیسرا افسانوی مجموعہ ''دیدۂ حیراں'' جس میں ۲۴ افسانے ہیں جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔

اگر چہ مظفر حنفی کا مسلسل قیام دہلی میں رہا مگر بھوپال کی ادبی فضا پر ان کے اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے اکثر افسانے ملک کے مقتدر اخبارات و رسائل کے ساتھ ساتھ بھوپال کے اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ اور ادبی محفلوں میں ان کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مظفر حنفی نے اپنے افسانوں کے ذریعہ سماج میں پھیلی برائیوں، سیاسی حالات، سماجی اقدار کی گراوٹ کو پیش کیا ہے۔ عام طور پر انہوں نے نچلے اور متوسط طبقے کے مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ملک میں غربت اور بدحالی، سیاسی بے انصافی اور اخلاق کی گراوٹ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں فکر کی پختگی اور تازگی موجود ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''اینٹ کا جواب'' کے پیش لفظ میں افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فراقؔ گورکھپوری رقمطراز ہیں:

''مظفرؔ حنفی صاحب ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک ہونہار ادیب ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی

عکاسی ہے۔ بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ ان میں نیا پن ہے۔ ان کا انداز دلکش ہے، مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدت ہے پڑھنے والوں کو یہ افسانے کہیں سے گراں نہیں گزریں گے۔ ان افسانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر نوجوان مصنف نے اپنی کوشش جاری رکھیں تو وہ ترقی کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کرتے جائینگے۔ ایسی مختصر افسانہ نگاری جسے ہم حقیقت نگاری بھی کہہ سکیں، دنیائے ادب میں سب سے نئی صنف ادب ہے''۔[۱]

مظفر حنفی نے جدید موضوعات پر افسانے تحریر کئے ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں کا اسلوبِ بیان روایتی ہے عام طور پر ان کے افسانوں کی ٹیکنیک بیانیہ ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں علامت وابہام کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اس کے متعلق اپنے افسانوں کے مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

''میرے افسانے اس عہد میں جدید کہے جاتے تھے۔ رومانیت سے اجتناب کرتے ہوئے ان میں حقیقت نگاری، کہانی پن اور طنز کے امتزاج سے بات کو بالکل نئے انداز میں کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔''۔[۲]

بھوپال میں انضمام کے بعد افسانہ لکھنے والوں میں عیسیٰ صدیقی کا نام بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر محمد نعمان کے مطابق عیسیٰ صدیقی نے بیشتر افسانے انضمام کے بعد لکھے ہیں جو عموماً اس زمانے میں ملک کے مقتدر اخبارات اور رسائل مثلاً آج کل، شاعر، سویرا، مزاج، الجبل وغیرہ میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ انہوں نے اگرچہ افسانہ کم تعداد میں لکھے لیکن کم وبیش سبھی افسانے معیاری اور موجودہ عہد کے مذاق کے مطابق ہیں ان کے افسانے ابتداًترقی پسند نظریات کے حامل ہیں۔ لیکن بعد میں جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہوکر اس انداز کے افسانے لکھے۔ انہوں نے تلاش ذات اور

---

۱ پیش لفظ۔اینٹ کا جواب۔از مظفر حنفی۔ص۵

۲ اعتراف۔دیدۂ حیراں۔ از مظفر حنفی۔

زندگی کے مسائل کو بیک وقت پیش کیا ہے۔یعنی زندگی کی سچائیوں کو اپنے ذاتی تجربات کے ساتھ افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔انہوں نے موجودہ دور کے سنجیدہ مسائل،اسلوب اورفن میں بڑی حد تک روایت کی پاسداری بھی کی ہے۔

۱۹۵۵ء میں ان کا ایک افسانہ ''جب تک یہ رات نہیں ڈھلتی'' حمیدیہ کالج بھوپال کے میگزین میں شائع ہوا۔جس میں مالک کے بلّے کے بیمار ہوجانے اوراسکی نازبرداری اورنوکرانی کے چھوٹے بھائی کے بیمار ہوجانے پراس کی بےچینی اورفکرمندی کونظرانداز کردینے کو بڑے طنزیہ انداز میں پیش کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کے سماج میں ایک انسان کی حیثیت ایک جانور سے بھی گئی گزری ہے۔اس افسانے میں سماجی نابرابری اور نچلے طبقے کومسلسل نظرانداز کئے جانے کو پراثر انداز میں پیش کیا ہے۔

عیسیٰ صدیقی کے دوسرے افسانے''بےآوازآدمی کی کہانی''اور''سوچا ایک سوداگرنے بھی'' ایسے ہی سماجی ناہمواری کے موضوع پرمبنی ہیں۔جس میں مشینی دور کے انسان کی مادّہ پرستی کے دباؤ میں ٹوٹتے رشتوں کے درد کوپیش کیا گیا ہے۔

انضمام کے بعداردوافسانہ لکھنے والوں میں اطہرصابری کا نام بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے پرجوش انداز میں افسانہ نگاری کی ابتداء کی اورکافی پسند بھی کئے گئے ان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تو موجودتھی اوراپنی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوالیا مگرجلد ہی افسانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ان کے افسانوں کا مجموعہ''زخم ہنستے ہیں''۱۹۶۴ء میں شائع ہوا جس میں محض سات افسانے ہیں۔ان کے بیشترافسانے رومانی ہیں جن میں کرداروں کےنفسیاتی رویوں،ہوسناکی،جنسی تعلق کوپیش کیا ہے۔کہیں کہیں ان کی تحریروں میں فحش گوئی بھی حاوی ہے۔ان کے افسانوں کے کردارزندہ اورمثالی ہوتے

ہیں جس کے متعلق کوثر چاند پوری لکھتے ہیں:

''اطہر صابری کا نام بالکل نیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کا تعلق نئی نسل کے اس طبقے سے ہے جس نے کہانی کی سرسبز وادیوں میں ابھی پہلا قدم ہی رکھا ہے۔۔۔۔۔ اطہر کی کہانیوں میں اکثر کردار نگاری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں مثلاً ان کا ایک کردار ''اچھو میاں'' بڑا جاندار اور رنگارنگ قسم کا ہے۔ اچھو میاں بہت بے باک، صاف گو، مگر جاہل اور اکھڑ قسم کا کردار ہے لیکن اس کی فطرت میں ایک حسین لوچ اور تعمیری گداز بھی ہے۔''[۱]

پروفیسر آفاق احمد نے بھی چند افسانے لکھے۔ ان کے اسلوب میں رنگینی اور دلآویزی ہے۔

اظہر راہی نے بھی کافی تعداد میں افسانے لکھے۔ ان کا افسانہ ''زہر'' رسالہ آج کل میں شائع ہوا۔ جس پر ان کو انعام سے نوازا گیا۔ انہوں نے افسانے کے موضوع اور ٹیکنیک پر تجربے بھی کئے مگر وہ افسانہ نگاری کے میدان میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکے۔

بھوپال کے افسانہ نگاروں میں ایک نام قیوم جاوید کا بھی ہے۔ ویسے تو انہیں طنز و مزاح نگاری میں شہرت حاصل رہی۔ لیکن انہوں نے چند افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانوں میں ''گوری اتری گنگا پار''، ''قتل گاہیں''، ''دوسرا جنم'' وغیرہ رومانی اور اصلاحی موضوعات پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فکری عنصر غالب ہے اور اثر انگیزی بھی ہے۔ لیکن انہوں نے چند ہی افسانے لکھے۔

خالد عابدی نے بھی کچھ بیانیہ قسم کے افسانے لکھے ہیں۔ ان کا ایک مختصر افسانچوں کا مجموعہ ''نقطۂ نوگریز'' شائع ہوا اس میں موجودہ حالات پر کئی پر اثر افسانچے ہیں جو ان کی قادرالکلامی اور مہارتِ فن کے ضامن ہیں۔

۱؎ بحوالہ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۸۱

اقبال جعفری کو بھی بھوپال کے افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کے افسانے اپنے دور کے رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''یادوں کے چراغ'' میں ۲۰/افسانے ہیں جو مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال سے شائع ہوا۔ اقبال جعفری کا طرز بیان سادہ اور سلیس ہے۔ زیادہ تر افسانے بیانیہ ہیں۔ اختصار ان کے افسانوں کی خوبی ہے ان کے افسانے پیچیدگی اور الجھاؤں سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ کم الفاظ میں اپنی بات کہنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں نرم گوئی اور لطافت ہے۔ مگر کوئی خاص فکری بلندی نہیں ہے۔ اقبال جعفری کے اسلوب بیان کے متعلق پروفیسر عبدالقوی دسنوی رقمطراز ہیں:

''(اقبال جعفری) کے افسانے سیدھے سادے، عام فہم، دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی بات دوسروں تک آسانی سے پہنچے اور انہیں ان کا ہم خیال بنا دے اس لیے وہ زبان نہایت سادہ، انداز نہایت سلجھا ہوا اور پیچیدگیوں سے پاک اختیار کرتے ہیں۔ ایک خوبی ان کی یہ بھی ہے کہ افسانہ عام طور پر مختصر ہوتے ہیں۔ موجودہ مصروف زمانے میں انہیں پڑھنے کے لیے وقت بھی نکالا جا سکتا ہے اور ان سے لطف اندوز بھی ہوا جا سکتا ہے۔''[1]

کوثر صدیقی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ انہوں نے تمام شعری اصناف کے علاوہ ماہیے، مزاحیے بھی لکھے اور بچّوں کی نظمیں اور منظوم ترجمے پر بھی بڑی مہارت سے قلم اٹھایا ہے۔ وہ صحافی بھی ہیں اور نثر نگار بھی لیکن افسانہ نگاری پر ان کا قلم اس وقت بے قرار ہو کر چل پڑا جب ۲۰۰۲ء میں گجرات فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں آ گیا ظلم و ستم اور آگ و خون کے ان مناظر نے ہر حساس اور انسانیت

[1] بھوپال کا کا ایک افسانہ نگار۔ از پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ مطبوعہ کتاب نما دہلی۔

دوست شخص کے جذبات میں ہل چل پیدا کر دی۔ کوثر صدیقی نے کم وبیش ۱۶/افسانے ان فسادات کے موضوعات پر تحریر کئے۔ افسانوں کے اس مجموعے کا نام ''آگ'' ہے جو اس کے حسبِ حال بھی ہے۔ اس مجموعے کا حصہ اول ۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا حصہ نظمانے کے عنوان سے ہے اس میں نو نظمیں ہیں۔ حصہ سوم میں غیر مطبوعہ منی کہانیاں شامل ہیں۔ حصہ اول پر خود افسانہ نگار نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے:

''گجرات المیہ (۲۰۰۲) کے پس منظر میں لکھی گئیں کہانیاں''

صفحہ ۹ پر کتاب کا انتساب ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

گجرات المیہ (۲۰۰۲) میں

اُن خواتین کے نام جو بیوہ ہو گئیں۔

اُن مردوں کے نام جن کے جیون ساتھیوں کو فساد نما

دہشت کا دیو نگل گیا۔

ان دوشیزاؤں اور خواتین کے نام جن کی آبرو لُٹ گئی۔

ان بچوں کے نام جو یتیم و یسیر ہو گئے۔

ان بچوں کے نام جو ماں کے بطن میں ہی شہید کر دیے گئے۔

ان لوگوں کے نام جو خانماں برباد ہو گئے۔

اور

ان کے نام بھی

جن کی آنکھیں، کان اور منھ بند ہیں، اور ضمیر بھی خاموش''[1]

---

[1] افسانوی مجموعہ ''آگ'' از کوثر صدیقی۔ ص ۹

ان افسانوں کے متعلق وہ اپنے تحریر کردہ مضمون ''آنسوں بے زبانوں کی زبان'' میں تحریر کرتے ہیں:

''گجرات المیے کے آنسو مظلومین تک ہی محدود نہیں اس المیے سے ہر وہ شخص مجروح ہوا ہے جسے انسان کہا جائے بشرطیکہ اس کا انسانیت سے رشتہ ہو۔ جہاں انسان شیطان کا مرید ہو جائے وہاں امام حسینؑ کے سر مبارک کو نیزے پر اٹھا کر چلنا بھی باعثِ فخر و فتح سمجھا جاتا ہے۔ کاغذ قلم سے جن کا ادبی رشتہ ہے وہ عام انسان سے نسبتاً کچھ زیادہ حساس ہوتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اظہار کی صلاحیت اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت رکھتے ہیں۔ گجرات کے المیات کے جزئیات اخبارات میں مسلسل پڑھتے رہنے اور ٹیلی ویژن پر دیکھتے رہنے کے بعد آنسوؤں کا کاغذ پر نقش ہونا فطری عمل تھا۔ پہلے ایک نظم کہی، پھر کچھ غزلیں، دوہے اور نظمانے بھی کہے۔ لیکن شاعری رمز و کنایہ کی زبان ہے اس لیے کچھ لکھ کر بھی کچھ نہ لکھنے کا احساس ہوا۔ گجرات کی اس نئی کربلا میں مظلومین اور مہلوکین پر جو گذری اسے لکھنے کا فرض تو مؤرخین کا ہے لیکن بہ حیثیت ایک قلمکار مظلومین کی ''آپ بیتی'' کو ''جگ بیتی'' کے انداز میں، قارئین کی دلچسپی ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، بیان کرنے کے لیے مجھے افسانہ موثر صنف نظر آیا۔ گجرات میں جیسا ہوا، جیسا گذرا، جیسا سنا، پڑھا اور دیکھا، اسے افسانوی رنگ میں پیش کرنے کی یہ ادنیٰ کوشش ہے۔ میں فن افسانہ نگاری سے واقف نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ مظلومیت کا دُکھ درد سمجھنے میں یہ کہانیاں قارئین کی رہنمائی کرسکتی ہیں۔ ان کہانیوں کے واقعات، پلاٹ،

منظر نامے اور کردار وغیرہ خیالی ہیں۔ اور حقیقت یا اصلیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے''۔[1]

کوثر صدیقی کے افسانوں کے مجموعے'' آگ'' میں اقبال انصاری کا مضمون'' حقیقتوں کی یہ کہانیاں'' کے عنوان سے شامل ہے۔ جس میں کوثر صدیقی کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال انصاری رقمطراز ہیں:

'' کوثر صدیقی کے افسانوں کے مجموعہ'' آگ'' سے جو Massage نکل کر Float کر رہا ہے وہ یہی ہے کہ'' انسان'' نہیں مرا ہے۔ انسانیت زخموں سے چور چور تو ہوگئی ہے، لیکن زندہ ہے۔ اکیسویں صدی کے دوسرے سال کے شروع کے چھ ماہ کے گجرات سے گذرنے کے بعد بھی اگر کسی کے ہاتھ سے رجائیت کا دامن نہ چھوٹے تو میں اسے بڑا آدمی کہوں گا۔ اور اس لحاظ سے کوثر صدیقی بڑے آدمی ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کے اس مجموعے کے حصہ اول کی تمام کہانیاں فساد کا موضوع یا فساد کا پس منظر لئے ہوئے ہیں۔ ایک حساس اور دردمند صاحب قلم کار ہونے کے ناطے انہوں نے بڑی گہری نگاہ سے فسادات کا مشاہدہ کیا ہے، جائزہ لیا ہے۔ ان کی ان کہانیوں کی جو بات سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے اور جس کے لیے وہ شانے پر ایک والہانہ شاباشی تھپکی کے مستحق ہیں وہ ہے ان کا Attitude ان کی تنقید کا نشانہ نہ ہندو ہے نہ مسلمان ۔۔۔ بلکہ برے اعمال، قبیح افعال، منفی سوچ اور گمراہی انکی تنقید کا نشانہ ہیں۔۔

---

[1] افسانوی مجموعہ۔ آگ۔ ازکوثر صدیقی۔ صفحہ ۷۔۸

کوثر صدیقی نے صرف شعلے ہی نہیں دیکھے ہیں۔شبنم پر بھی ان کی نگاہ گئی ہے۔انہوں نے صرف جلتے ہوئے گھر اور آنگن ہی نہیں دیکھے ہیں۔فساد کے ان شعلوں میں اگر کہیں سونا تپ کر کندن بن رہا ہے تو ان کی نگاہ اس کندن پر بھی گئی ہے۔اور اب ایک تعمیری ادیب کی حیثیت سے انہوں نے جلتے ہوئے مکانوں سے زیادہ اس کندن کو Highlight کیا ہے۔''مانوسیوا سمیتی'' ''کچے دھاگے کی طاقت'' ''ایثار'' اور ''رمن اور حسن'' ایسی کہانیاں ہیں۔''[1]

بھوپال میں نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں اقبال مسعود، مختار شمیم، سکندر ضمیر، علی متقی دسنوی، یعقوب یاور کوثی اور اسد کے نام بھی اہم ہیں۔

بھوپال کے افسانہ نگاروں میں اقبال مسعود خاص مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے شاعری اور افسانہ نگاری میں اپنی قلم کا جادو جگایا ہے۔اکثر ان کے افسانے ملک کے معروف رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔

اقبال مسعود نے افسانہ نگاری کا آغاز رومانی افسانے لکھ کر کیا۔ان کا پہلا افسانہ ''بیر بہوٹیاں'' اسی طرح کا افسانہ ہے۔جس میں انہوں نے پٹھان قبیلے کے ایک نوجوان کی داستانِ محبت کو پیش کیا ہے۔اس افسانے کا انجام حیرت میں ڈالنے والا ہے۔جس میں نوجوان عاشق ایک فوجی کی گولی کا شکار بن جاتا ہے۔اس کیفیت کا بیان اقبال مسعود نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''روایت ہے کہ جہاں اس کے خون کے قطرے گرے تھے وہاں برسات کی برسات بیر بہوٹیاں نکل آتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بیر بہوٹیاں اس کے خون کے قطرے ہیں جو زندگی کی بہار دیکھنے کے لیے زمین سے ابھر آتے ہیں۔''[2]

---

[1] حقیقتوں کی یہ کہانیاں۔مطبوعہ ''آگ'' از کوثر صدیقی۔ص ۵۔۶

[2] بحوالہ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ص ۱۹۰

جیسے جیسے ان کی نظر بالغ ہوئی انہوں نے سنجیدہ اور فکر انگیز مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ افسانے کے فن اور ٹیکنیک پر انکی گہری پکڑ ہے وہ نئے نئے تجربات بدلتے ہوئے رجحانات کو اپنے افسانوں میں خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں کی زبان شاعرانہ ہے جو بے حد مزہ دیتی ہے۔ انکی زبان پر شاعری کا غلبہ اس قدر ہے کہ انہیں افسانے کہنے میں بھی تردّد ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں خوابوں کی دنیا سجاتے ہیں۔ تصور کی آنکھوں کے دلکش مناظر پیش کرتے ہیں لیکن جہاں طنزیہ پیرائیہ ہے ان میں سادہ اور سلیس طرز بیان کے ساتھ طنز کے لیے تیکھا پن اور دھاردار الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ''بیر بہوٹیاں'' ''ایک فرشتے سے انٹرویو'' ''پڑوسی کے بچّے'' اور '' ہے جرم ضعیفی کی سزا'' کافی مقبول ہوئے۔

بھوپال کے نوجوان افسانہ نگاروں میں علی متقی کا نام خصوصی طور سے لیا جا سکتا ہے۔ وہ نئی نسل کے نمائندے ہیں۔ ان کے یہاں اپنے افسانوں میں رومانیت اور جذباتیت کے اثرات بھی نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ علی متقی کے زیادہ تر افسانوں میں علامتی اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں پیچیدگی کے ساتھ انسانی مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے ان کی کہانی ''یوریکا'' کو پڑھ کر علی متقی اور اقبال مسعود کے افسانوں کے متعلق رتن سنگھ نے جس رائے کا اظہار کیا اسے ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے اپنی کتاب ''بھوپال میں اردو انضمام کے بعد'' میں شامل کیا ہے:

> ''آج کی شام افسانہ'' کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ دو نئے افسانہ نگار جناب علی متقی دسنوی اور اقبال مسعود کی کہانیاں سننے کو ملیں۔ دونوں کہانی کاروں کے یہاں اتنی جان نظر آئی کہ امید ہے کہ آنے والے کل میں منٹو اور کرشن چندر کی جگہ پر کر سکیں گے۔ میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔''[۱]

---

[۱] بحوالہ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۹۲

مختار شمیم اگر چہ سرونج کے رہنے والے تھے لیکن بھوپال کی ادبی محفلوں سے مسلسل وابستہ رہے اور دورانِ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھوپال میں ہی سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''پسِ غبار'' چھ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان سب کے موضوعات روایتی ہیں لیکن اندازِ بیان نیا ہے۔

بھوپال کے علامتی افسانہ نگاروں میں اسد کا نام بھی لیا جا سکتا ہے ان کے چار افسانے ''گمشدہ مکان''، ''پلاسٹر''، ''سامنے کا اندھیرا'' اور ''رات کا تیسرا پہر'' رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں علامتی انداز اختیار کرتے ہیں۔

یعقوب یاور کوٹی نے بھی کچھ علامتی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں انتظار حسین کا انداز نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے ''آگ اور دھواں'' تناسخ''، ''کرفیو'' ناخواستہ'' کے نام سے ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو چکے۔ اس کے علاوہ انہوں نے چند جرمن کہانیاں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

بھوپال کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں سکندر ضمیر نے بھی اپنا نام درج کیا ہے۔ ان کا افسانچوں کا مجموعہ ''روشنی'' شائع ہو چکا ہے۔ ان کے افسانچوں میں اعلیٰ اخلاقی موضوع، اصلاحی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ جن میں موضوع اور اسلوب میں یکسانیت بہت ہے۔

کچھ ایسے بیرونی اہل قلم بھی ہیں جنھوں نے بھوپال میں رہ کر اردو افسانے کو فروغ دیا اور یہاں کے افسانہ نگاروں کو بڑی حد تک متاثر بھی کیا۔ ان میں اہم نام اقبال مجید، قمر الحسن، رتن سنگھ، ست پرکاش سنگر اور کوثر جہاں کے نام شامل ہیں۔

اقبال مجید کا شمار اردو کے نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ویسے تو انہوں نے ڈراما نگاری،

طنز مزاح نگاری اور شاعری کو بھی اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن ان کی ہمہ جہت شخصیت کی پہچان افسانہ نگاری اور ناول نگاری سے ہوئی۔ ان کے افسانوں کی ہندوستان اور پاکستان میں بیحد پذیرائی ہوئی اور اردو ادب کے علاوہ ترجمہ ہوکر ان کے افسانے ہندی، مراٹھی، روسی اور انگریزی زبانوں کے اہم رسائل میں شائع ہوئے۔ بہر حال وہ ہندوستان گیر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ ان کے افسانے اپنے عہد کی زندگی اور سماج کے عکاس ہیں۔ حقیقت نگاری ان کی خاص خوبی ہے۔ انسانی نفسیات پر ان کی گہری پکڑ ہے ان کی تحریروں میں سماج پر طنز اور اصلاح کی کوشش بھی موجود ہے۔

دورانِ تعلیم افسانہ لکھنے کی ابتداء لکھنؤ میں قیام کے دوران ہوئی۔ حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر احتشام حسین اور اسرارالحق مجاؔز سے مسلسل صحبتیں رہیں۔ جس کا اثر اس نوخیز فنکار کے لئے آبِ حیات ثابت ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں جب اقبال مجید لکھنؤ میں مقیم تھے ترقی پسند تحریک بھی اپنے عروج پر تھی اس کے اثرات بھی اقبال مجید پر بہت گہرے اور دیرپا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان اقبال مجید نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ پہلا افسانہ ''عدّو چاچا'' بہت پسند کیا گیا۔ ریڈیو کی ملازمت کے درمیان بھوپال آئے بھوپال ریڈیو اسٹیشن میں پروڈیوسر کے عہدے سے ۱۹۹۲ء میں سبکدوش ہوئے۔

اقبال مجید کے چھ افسانوی مجموعے ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' ۱۹۷۰ء (پہلا مجموعہ) ''ایک حلفیہ بیان''۔ ۱۹۸۰ء (دوسرا مجموعہ) ''شہر بدنصیب'' ۱۹۹۷ء ''تماشا گھر'' ۲۰۰۲ء ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' ۲۰۱۰ء اور ''قصہ رنگِ شکستہ'' ۲۰۱۱ء کے علاوہ دو ناول ''کسی دن'' جنوری ۱۹۹۸ء۔ نیا سفر پبلیکیشنز الہ آبادی سے اور ''نمک'' مارچ ۱۹۹۹ء میں اتر پردیش اردو اکامی لکھنؤ کے جزوی مالی امداد سے شائع ہوا۔

اقبال مجید نے افسانوں میں موضوعات سماج کے مسائل اور ترقی پسند نظریات سے متاثر ہو کر لیے ہیں کہیں ان کا انداز بیانیہ ہوتا ہے۔اور اکثر علامتی انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔اقبال مجید کی افسانہ نگاری پر تبصرہ رکرتے ہوئے مہدی جعفری لکھتے ہیں:

''اقبال مجید اپنے افسانوں کے لہجے میں پختگی اور طمانیت کی نمایاں پہچان قائم کرتے ہیں۔ پرانی قدروں اورعصری حسیّت کے تال میل میں قدیم اسلوب استعمال ہوتا ہے اور اس میں بڑی خود اعتمادی جھلکتی ہے جہاں تک نئی حسیّت کا تعلق ہے اسکے اظہار میں پرانے اسلوب کا استعمال بڑی محنت کا طلبگار ہوتا ہے۔ امنڈتے ہوئے عصری دھاروں کا ایسے اسلوب میں ڈھالنے کے لیے بس کوشش اور جانفشانی کی ضرورت ہوتی ہے اسے اقبال مجید جیسا پختہ فنکار ہی محسوس کرسکتا ہے۔''[1]

ان کا افسانہ ''تماشہ گھر'' آج کے دور کے اُن حالات کے کشمکش کو ظاہر کرتا ہے جہاں ایماندار انسانوں کی زندگی ان کی نیکیوں کی سبب بھی مصیبت بن گئی ہے۔اس افسانے میں موجودہ حالات اور معاملات کی وہ درد بھری کہانی بیان کی گئی ہے جو آج اس ملک میں عام طور پر مزدور اور ہر کمزور کی کہانی ہے اور جو مجبور اور بے کس غریب لوگوں کا مقدر بن گئی ہے جن کے پاس انصاف پانے کے ذرائع نہیں۔

قانون تو بہت بنائے جاتے ہیں مگر ان پر عمل کرانے کے لیے بھی پیسے دینے ہوتے ہیں جس کے پاس پیسہ نہیں ہے اس کے لیے اس کی زندگی ہی بہت بڑا بوجھ ہے۔اقبال مجید نے اپنے افسانوں کے کردار حقیقی زندگی سے اخذ کئے ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار عام انسان کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کی کردار نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں:

---

[1] ایک حلفیہ بیان۔از اقبال مجید۔ص۱۴۔۱۵

''اقبال مجید کے افسانوں کے کردار دیو مالائی کردار نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہیں جو نہ فرشتہ ہیں اور نہ شیطان بلکہ اپنی فطری نیکی اور بدی کے ساتھ ایک عام فرد کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی خوبی ان میں دل آویزی اور کشش پیدا کردیتی ہے۔''[۱]

بھوپال کے اس مایہ ناز افسانہ نگار اقبال مجید کا انتقال ۱۸/جنوری ۲۰۱۹ء کو بھوپال میں ہوا اور یہیں سپرد خاک کئے گئے۔

ست پرکاش سنگر کا افسانوی مجموعہ ''آشا دیپ بجھے نہ'' بھوپال میں ہی شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل بارہ افسانے شامل ہیں انہوں نے بھوپال میں رہ کر یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور ''حلقۂ دانشوران'' کی بنیاد ڈالی۔

ست پرکاش سنگر نے اپنے افسانوں میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ سماجی مسائل اور موجودہ حالات کو نہایت اثر انگیزی کے ساتھ پیش کیا۔

اسی طرح رتن سنگھ اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو بھوپال میں دو سال تک ملازمت کی اس دوران بھوپال میں رہ کر افسانہ بھی تحریر کیے۔ وہ قیامِ بھوپال کو زندگی کے خوبصورت عرصے میں شمار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں خود لکھتے ہیں:

''میں یہ بات اکثر کہا کرتا ہوں کہ میری زندگی کے بہترین سال وہ ہیں جو میں نے بھوپال میں گزارے ہیں۔ یہ عرصہ بہت مختصر تھا۔ صرف دو سال کا، لیکن سکھ تو زندگی میں دو سال کیا ایک پل بھی مل جائے تو ساری زندگی کے دکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ تھوڑا سا سکھ بھی انسان کو اس قدر توانائی بخش سکتا ہے کہ وہ اس کے سہارے زندگی کے دکھ جھیلنے کے قابل ہو جائے۔

---

۲ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۹۸

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ۱۶ دسمبر ۱۹۶۲ء کی صبح کو بھوپال پہنچا تھا۔ اس دن میں نے ریڈیو کے محکمے میں اپنی ملازمت کی شروعات کی تھی۔ مجھے پہلی نظر میں ہی بھوپال کی دھرتی اس لیے پسند آ گئی تھی کہ مجھے مزاجاً میدانی علاقوں کے سیدھے سپاٹ راستے پسند نہیں۔ وہ راستے ہی کیا ہوئے جو ٹیڑھے میڑھے، بل نہ کھائیں اور اونچائیوں نیچائیوں سے نہ گزرتے ہوں۔ اور بھوپال کی دھرتی ہی ایسی ہے۔ ہر موڑ پر نئے نشیب وفراز، ہر موڑ پر نئی دلکشی، نیا حسن۔'' [1]

رتن سنگھ کے افسانوں کے موضوعات میں اگرچہ بہت زیادہ وسعت نہیں۔ لیکن ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے انہوں نے بار بار کے لکھے ہوئے موضوعات کو نہیں چھیڑا۔ بلکہ نئے موضوعات کو اپنے افسانوں میں شامل کیا ہے۔ افسانے کے فن سے انہیں مکمل آگاہی ہے۔ وہ افسانہ لکھتے وقت طرز بیان اور زبان کی سادگی پر خصوصی نگاہ رکھتے ہیں اسی لیے ان کے افسانوں میں اثر انگیز بہت ہے۔ ان کے افسانوں کے مسائل اور کردار عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

بھوپال کی خواتین افسانہ نگاروں میں کوثر جہاں کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان کا وطن جبلپور تھا لیکن انہوں نے زندگی کا طویل عرصہ بھوپال میں گذارا ان کا پہلا افسانہ ''روبی'' ۱۹۶۳ء میں کراچی سے شائع ہونے والے پرچے ''جامِ نو'' میں شائع ہوا۔ انہوں نے روایتی اور جدید انداز کے امتزاج کے ساتھ رومانی رنگ کے افسانے زیادہ لکھے ہیں۔ انہوں نے ''گھر کا چراغ''، ''روشنی'' ''برگد کا پیڑ''، ''احساس'' اور ''سوکھی جھیل'' وغیرہ افسانے بھوپال میں ہی لکھے ہیں۔

اس کے علاوہ بھوپال میں خواتین افسانہ نگار کافی تعداد میں نظر آتی ہیں۔ جن میں اختر جمال، زہرہ جمال، پروین رشدی، صفیہ قریشی، قمر النساء، حسینہ بانو تبسم، شفیقہ فرحت، انیس سلطانہ، رضیہ حامد، فرحت جہاں وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

---

[1] یادِ بھوپال۔ مطبوعہ ارمغان سیفیہ۔ ص ۲۲۲

اختر جمال نے افسانوں کی ابتداء ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر کی۔اسی کے اثرات ان کے افسانوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مسائل کوتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات عام انسانی زندگی کے دکھ درد ہیں۔ اختر جمال کا شمار بھوپال کی کامیاب خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

زہرہ جمال ممتاز افسانہ نگار اختر جمال کی بہن ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اختصار پسندی کے ساتھ سماجی مسائل پر قلم اٹھایا۔

بھوپال کی خواتین افسانہ نگاروں میں شفیقہ فرحت کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر طنز مزاح نگار ہیں۔ اردو ادب میں ان کی شناخت انشائیہ نگاری اور خاکہ نگاری کی حیثیت سے قائم ہے۔لیکن اس کے علاوہ انہوں نے جو افسانے لکھے ہیں۔انکا ادب میں اہم مقام ہے۔ان کے افسانوں میں فنی مہارت ہے۔ زیادہ تر افسانے بیانیہ ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی تلخیاں، سماجی نابرابری اور ترقی پسند نظریہ کے ساتھ زندگی کی ناآسودگی کو پیش کرتی ہیں۔سماجی اقدار کا زوال ان کے افسانوں میں خاص طور پر پیش ہوا ہے۔ ان کے افسانوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر نعمان خاں رقمطراز ہیں:

> ''افسانہ'' آپ نے کھانا کھالیا؟'' بھی عورت کی زندگی سے متعلق ہے جس میں افسانہ ''منظور ہے'' کی عورت کی فطرت، مظلومیت، بےبسی، ایثار اور وفاداری کو موثر طور پر پیش کیا ہے۔ان دونوں افسانوں کے علاوہ ''اللہ میگھ دے'' ''رشتہ پہچان کا'' ''زندگی اے زندگی'' ''ساتواں طبق'' اور ''زندگی کا کباڑ خانہ'' کا شمار شفیقہ فرحت کے بہترین افسانوں میں کیا جاسکتا ہے۔''[1]

بھوپال کی بہترین خواتین افسانہ نگاروں میں فرحت جہاں صفِ اول کی افسانہ نگار تسلیم کی جاتی

---

[1] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد''۔ڈاکٹر محمد نعمان کاں۔ص ۱۸۴

ہیں۔ انہوں نے ابتداء میں ہی اپنی الگ پہچان قائم کرلی۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''بازیافت'' مدھیہ پردیش اردواکادمی بھوپال سے شائع ہوا۔ جو ۱۸/افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان کے افسانے ملک کے معروف رسائل ''آج کل''۔''شاعر''''بیسویں صدی'' وغیرہ میں شائع ہوئے۔

فرحت جہاں اپنی کہانیوں میں زبان بہت رواں اور خوبصورت الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو چھوٹے چھوٹے جملوں سے سنوارتی اور آگے بڑھاتی ہیں۔ وہ معمولی واقعہ کو بھی افسانے کا موضوع بنالیتی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں پر ہونے والے ظلم و جبر اور سماجی استحصال کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ حقیقت کے بیان میں ان کے لہجے میں تلخی بھی پائی جاتی ہے۔ عموماً افسانوں میں فکر انگیزی اور دردمندی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔

ان کا مشاہدہ گہرا ہے، جذبات نگاری پر پوری طرح قادر ہیں۔ ان کے افسانے دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں جن خواتین افسانہ نگاروں نے افسانوی فن کی طرف توجہ مرکوز کی ہے ان میں فیروزہ یاسمین بھی نئی خواتین افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''احساس کے دریچے'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جس میں ۲۶/افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں سادگی اور حقیقت پسندی صاف طور پر نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ پری خانم نے بھی افسانہ لکھے۔

پروفیسر ارجمند بانو اگرچہ محقق، ناقد اور شاعرہ کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہیں ان کے بھی چند افسانے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوکر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں ''جھلسے ہوئے ہاتھ'' مطبوعہ حمیدیہ کالج میگزین، اور ''زندگی'' مطبوعہ ''صدائے اردو'' بھوپال خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سلطانہ حجاب بھی اچھی افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے بھی اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور ادبی محفلوں میں بھی سننے کو ملتے ہیں۔

بھوپال کے ہی نہیں ملک گیر شہرت یافتہ اور ہند و پاک میں یکساں مقبولیت حاصل کرنے والے اہم ترین افسانہ نگار بھی اس سرزمین سے ابتداء سے تا حال وابستہ رہے اور اپنے شہر بھوپال کا نام بھی روشن کیا۔

بھوپال میں اردو افسانے کے اس ارتقائی کیفیت سے روشناس کرانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بھوپال کے بزرگ، نامور اور مشہور زمانہ افسانہ نگار نعیم کوثر کی افسانہ نگاری کا جائزہ ان حالات اور ماحول کے درمیان لیا جا سکے اور ہم عصر افسانہ نگاروں میں ان کے خصوصی مقام کا تعین کیا جا سکے۔

☆☆☆

باب سوم

نعیم کوثر کے سوانحی حالات اور شخصیت

نعیم کوثر کے سوانحی حالات اور شخصیت

نعیم کوثر کے حالاتِ زندگی:

عصر حاضر کے ممتاز و معروف افسانہ نگار، صحافی اور اردو ادب کی جانی مانی شخصیت نعیم کوثر کا پورا نام سید محی الدین اختر ہے اور دنیائے ادب میں وہ قلمی نام نعیم کوثؔر سے مشہور ہوئے۔ اگر چہ نعیم کوثؔر ۱۵ ؍دسمبر ۱۹۳۶ء کو بیگم گنج ضلع رائسین مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے ان کا وطن بھوپال ہے۔ ان کے والد سید علی کوثر چاند پوری نہایت مشہور، مقبول طبیب، ماہرِ فن، افسانہ نگار، ناول نگار، ناقد، بلند پایہ ادیب اور صحافی تھے۔ نعیم کوثؔر کا خاندان نہایت قابل عالم اطباء حضرات کا خاندان ہے۔

نعیم کوثر کے سلسلہء نسب کے متعلق ڈاکٹر نازنین اپنی کتاب ''وقارِ علم و حکمت: کوثر چاند پوری'' میں صفحہ ۳۲ پر لکھتی ہیں:

> ''مولوی ظہور الدین میراں ایک بزرگ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا سلسلہء نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تک پہنچتا ہے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ میراں سید معقوب جازوم سے ہندوستان وارد ہوئے۔ اور جون پور کے بعد ٹھنور ضلع بجنور میں آباد ہو گئے۔ '' رسالہ زیدیہ'' اور ''تاریخ وسطیہ''میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ مولوی سید ظہور کوثر چاند پوری کے اجداد میں ہیں اور حسب ذیل واسطوں سے ان کا سلسلہء

نسب ظہور اللہ تک پہو نچتا ہے۔علی کوثر بن حکیم ،علی مظفر بن حکیم ،سید منصور علی بن حکیم ،سید محمد علی بن حکیم ،مولوی سید رفعت اللہ بن حکیم ،مولوی ظہور اللہ............'' [۱]

نوٹ: ڈاکٹر نازنین خان نے محض کتابوں کے نام تحریر کئے ہیں مصنف کا نام اور صفحہ نمبر انھوں نے تحریر نہیں کیا۔
نعیم کوثر کے اجداد کے سلسلے میں ڈاکٹر نازنین خان مزید رقمطراز ہیں:

''نعیم کوثر کے پردادا حکیم سید منصور علی پیشہ سے طبیب اور معقول زمینداری کے مالک تھے۔ان کی سکونت سیوہارہ ضلع بجنور میں تھی۔حکیم منصور کے دو بیٹے تھے حکیم سید علی نظر اور حکیم سید علی مظفر۔پہلی بیگم کے انتقال کے بعد حکیم علی مظفر نے دوسری شادی چاندپور میں کی اور وہیں آباد ہو گئے۔نعیم کوثر کے دادا حکیم علی مظفر نامور حاذق طبیب تھے، شاعری بھی کرتے تھے۔نثر لکھنے کا ذوق تھا۔قصیدہ نگار بھی تھے۔منقبت اور بہت سے قصائد ان کی یادگار ہیں۔تحریکِ خلافت اور کانگریس کے دور میں نظموں کے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شائع ہوئے۔کئی قومی نظمیں شائع ہوتے ہی انگریزی حکومت نے ضبط کر لی تھیں۔'' [۲]

نوٹ: اس تحریر میں بھی ڈاکٹر نازنین خان نے کسی قسم کا حوالہ درج نہیں کیا محض کتابوں کا نام تحریر کیے ہیں۔مصنف کا نام اور صفحہ نمبر انہوں نے تحریر نہیں کیا۔

ڈاکٹر نازنین نے کتاب ''وقارِ علم وحکمت :کوثر چاند پوری'' میں مظفر حنفی کا مضمون بعنوان ''باتیں کوثر صاحب کی'' شامل کیا ہے جس میں مظفر حنفی ،کوثر چاند پوری کی پیدائش اور وفات کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

''پیدائش ۸/اگست ۱۹۰۰ء چاند پور یو۔پی وفات :۱۳/جون ۱۹۹۰ء دہلی'' [۳]

---

[۱] 'وقارِ علم وحکمت: کوثر چاندپوری۔ ازڈاکٹر نازنین خان۔ص۔۳۲

[۲] وقارِ علم وحکمت: کوثر چاندپوری۔از ڈاکٹر نازنین خان۔ص۔۳۲۔۳۳

[۳] ''باتیں کوثر صاحب کی۔مطبوعہ۔وقارِ علم وحکمت: کوثر چاندپوری۔ از ڈاکٹر نازنین خان۔ص۔۵

ڈاکٹر نازنین نے اسی طرح کتاب ''وقارِ علم وحکمت: کوثر چاند پوری'' میں نعیم کوثرؔ کا مضمون بعنوان ''ایک بے نیاز مفکر، محقق، ناقد، افسانہ نگار اور حاذق طبیب'' شامل کیا ہے جس میں نعیم کوثر، کوثر چاند پوری کی پیدائش اور وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''مالک رام نے ''تذکرہ ماہ سال'' میں کوثرؔ چاند پوری کا سال پیدائش ۱۹۰۸ء تحریر کیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے مختلف حوالوں سے اسے ۱۹۰۵ء قرار دیا ہے۔ راقم الحروف نے دونوں محققین کو کوثرؔ صاحب کی سرکاری سروس بک کے مطابق تاریخِ پیدائش ۱۸/ اگست ۱۹۰۰ء فائنل ہونا تحریر کیا تھا۔

کوثرؔ صاحب چاند پور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے اور ۱۳/ جون ۱۹۹۰ء کو دہلی میں انتقال ہوا''۔[1]

یہ نامور ہستی یعنی کوثرؔ چاند پوری جو نعیم کوثر کے والد ماجد ہیں۔ ۱۸/اگست ۱۹۰۰ کو پیدا ہوئے۔ یہ سنہ پیدائش نعیم کوثر کے مضمون ''ایک بے نیاز مفکر، محقق، ناقد، افسانہ نگار اور حاذق طبیب'' مطبوعہ ''وقارِ علم حکمت: کوثر چاند پوری''۔ ڈاکٹر نازنین خان۔ صفحہ ۲۱ پر تحریر ہے جو انہوں نے سرکاری کاغذات سے حاصل کی اور اسی کو درست ماننا مناسب ہے۔

کوثر چاند پوری نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور آصفیہ طبیہ کالج بھوپال سے طب یونانی میں ڈگری حاصل کی لاہور کے طبّی رسائل میں ایڈیٹر رہے پھر ریاست بھوپال کے محکمہ صحت میں حکیم کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اسی دوران کوثر چاند پوری کی شادی فاطمہ کوثر سے ہوئی۔ کوثر چاند پوری کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔ بڑے

---

[1] ایک بے نیاز مفکر، محقق، ناقد، افسانہ نگار اور حاذق طبیب۔ مطبوعہ۔ ''وقارِ علم حکمت: کوثر چاند پوری'' از ڈاکٹر نازنین خان۔ ص۔۲۱

بیٹے شمیم کوثر پرنسپل کے عہدے سے رٹائر ہوئے ۔ وہ کوثر صاحب کے رسالہ ''جادہ'' میں ''نقرئی دنیا'' نام سے کالم بھی لکھتے تھے نسیم کوثر اور نعیم کوثر کو بچپن سے ہی تقریریں کرنے کا شوق تھا۔ دونوں کی تقاریر کتابی شکل میں احمدی پریس الہ آباد سے شائع ہوئیں ۔ اس کے علاوہ نسیم کوثر اور نعیم کوثر کالج میگزین میں پابندی کے ساتھ افسانے اور مضامین لکھتے تھے۔ نسیم کوثر اردو میں ایم ۔ اے تھے اور سرکاری ملازم تھے اور بعد میں استعفٰی دیکر ہمدرد دہلی میں ملازم ہو گئے ۔ سب سے چھوٹے بیٹے حلیم کوثر MBBS کرنے کے بعد ملٹری میں کیپٹن رہے اب اوکھلہ دہلی میں کامیاب اور مقبول معالج ہیں ۔ کوثر چاند پوری کی تین بیٹیاں ہیں ۔ میمونہ سلطان ، صبیحہ الیاس اور صالحہ ظفر نظامی ، تینوں صاحبزادیوں کی شادیاں معزز گھرانوں میں ہوئیں ۔ ایک بیٹی کراچی میں اور دوسری اندور میں سکونت پذیر ہیں ۔ سب سے چھوٹی بیٹی صالحہ کوثر (مرحومہ) اردو کے نامور شاعر اور نثر نگار پروفیسر ظفر احمد نظامی کی شریکِ حیات تھیں ۔

نعیم کوثر کے کوائف ان کے مضامین کی کتاب ''نعیم کوثر کی افسانوی کائنات'' جو کہ اقبال مسعود نے مرتب کی ہے میں صفحہ نمبر ۱۲ پر ''شب و روز'' کے عنوان سے درج ہیں ۔ یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس میں ان کی زندگی کے بیش تر پہلو نمایاں ہیں :

شب و روز

نام : سید محی الدین اختر

قلمی نام : نعیم کوثر

پیدائش : ۱۵؍ دسمبر ۱۹۳۶ء بیگم گنج ضلع رائسین مدھیہ پردیش

وطن : بھوپال

والدین : سیدعلی کوثر چاندپوری ۔مستند حکیم اور اردو کے بلند قامت ادیب وافسانہ نگار/محترمہ فاطمہ کوثر ۔

چار بھائی شمیم کوثر ،نسیم کوثر ،نعیم کوثر اور ڈاکٹر حلیم کوثر ۔ تین بہنیں صالحہ ظفر نظامی میمونہ سلطان اور صبیحہ الیاس ۔

ابتدائی تعلیم : ۱۹۵۳ء اجمیر بورڈ سے میٹرک ۔ ۱۹۵۷ء آگرہ یونیورسٹی سے بی کام ۔

شادی : ۱۹۵۹ء محترم عبدالحمید قریشی کی صاحبزادی عائشہ (اب عائشہ نعیم) شریک حالات ومعاملات ہوئیں ۔حساب اور عربی میں ایم ۔اے ۔کی سند پا کر مدرسی کے عہدے سے ۲۰۰۴ء میں ریٹائرڈ ہوئیں اور ۲۰۰۴ء میں حج کی سعادت حاصل کی ۔

اولادیں : (۱) روبینہ کوثر ،ایم ایس سی ۔لکچرار (۲) ڈاکٹر فردوس کوثر ،ایم ۔ایس ۔ ماہر امراضِ چشم (۳) نوید کوثر ،ایم کام ۔ بینک ملازم ۔

ملازمت : مدھیہ پردیش ہاؤسنگ بورڈ بھوپال میں ایڈمنسٹریٹو افسر کی پوسٹ سے ۱۹۹۴ء میں ریٹائرڈ ہوئے ۔

ادب سے وابستگی : والدِ محترم کے تخلیقی نظم وضبط سے شعور نے آگہی حاصل کی ۔ ذہن ادب کی کائنات سے روشن ہوا ۔محض بارہ سال کی عمر میں پہلی کہانی ’’یتیم بچے کی عید‘‘ ،لکھی جو ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ ’’نونہال‘‘ دہلی میں شائع ہوئی ۔

ادبی سفر : ۱۹۴۹ء بچوں کے لیے طویل کہانی (ناولٹ) ’’ہونہار شہزادہ‘‘ حاتمی پبلشنگ ہاؤس حیدرآباد نے کتابی شکل میں شائع کی ۔

☆ ۱۹۵۰ء بچوں کے لیے لکھی گئی تقریریں الہ آباد سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔

پہلا افسانہ : ۱۹۵۰ء۔۱۴ سال کی عمر میں پہلا معاشرتی افسانہ ''تشنگی'' ماہنامہ جمالستان دہلی نے شائع کیا تھا۔

☆ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۰۷ء تک تقریباً ۶۵۰ / افسانے لکھ چکے ہیں جن میں بیشتر ہندو پاک کے نمائندہ رسائل و جرائد میں شائع ہوکر نہ صرف عوام بلکہ مشاہیر اہلِ علم و ادب سے داد و تحسین پاتے رہے ہیں۔

ڈرامے : ۱۹۷۰-۷۱ء۔ تقریباً دس ڈرامے معاشرتی و اصلاحی لکھے جو وقفے وقفے سے آل انڈیا ریڈیو کی بھوپال اردو سروس سے نشر کیے گئے ان ڈراموں میں صوتی اداکاری بھی کرتے رہے۔

افسانوی مجموعے : (۱) ''خوابوں کا مسیحا'' (کل ۲۰ / افسانے) ۱۹۹۹ء

(۲) ''کال کوٹھری'' (کل ۱۹ / افسانے) ۲۰۰۲ء

(۳) ''رگِ جاں کا لہو (ہندی افسانے) ۲۰۰۳ء

(۴) 'اقرارنامہ' (کل ۱۴ / افسانے) ۲۰۰۶ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع۔

(۵) چوتھا مجموعہ ''اگنی پریکشا'' (کل ۱۵ / افسانے) ۲۰۰۹ء

(۶) ''آخری رات'' (کل ۱۷ / افسانے) ۲۰۱۱ء

(۷) ''کُہرے کا چاند'' (کل ۱۴ / افسانے) ۲۰۱۸ء مدھیہ پردیش اردو اکادمی سے شائع ہوا۔

صحافت : ۱۹۵۹ء بچوں کا ماہانہ رسالہ ''جگنو'' بھوپال سے اپنی ادارت میں شائع کیا

اور کامل چالیس سال کی طویل خاموشی کے بعد ۲۰۰۱ء میں ''صدائے اردو'' جیسا ادبی اور معیاری پندرہ روزہ بھوپال سے جاری کیا جو ۱۶ سال کا طویل سفر کرتے دم توڑ گیا ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر کے علاوہ امریکہ، انگلینڈ، ماریشس اور پاکستان کے اردو نواز ہاتھوں تک پہنچتا رہا۔

اعزازات : مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا ادبی خدمات کے لیے ۲۰۱۸ء میں طویل ادبی خدمات کا اعتراف واعزاز۔

سرگرم ہے : کرکٹ ایسوسی ایشن مدھیہ پردیش کے ۱۹۷۶ء میں سکریٹری و نائب صدر رہے۔

شوق : کبھی جب آتش جواں تھا تو معیارِ حسن بھی برقی سامان تھا۔ اب عمر صفات کے دائرے میں ادبِ عالیہ کے مطالعہ تک سمٹ آئی ہے۔ صحت مند ادب فصیل ذوق پر خوشبو کی صدا دیتا رہتا ہے۔

لمحہ لمحہ سگریٹ پینا عادت میں شمار ہے۔ لباس سادہ اور رنگ صوفیانہ ہے۔

چہرہ ہر روز شیو کیا ہوا کھانے میں کسی قسم کا خاص اہتمام نہیں ہے

مزاج : اکھڑ اور خالص بھوپالی لہجہ۔ بے تکلف نجی محفلوں میں ضابطۂ اخلاق غیر پابند زبان سے ادا ہوتے درشت جملے، مزاج شوریدہ سر، اس وقت جب کوئی اردو زبان وادب پر حرف تراش ہو۔ مزاج وطبیعت میں انتہائی جذباتیت، اتنے مخلص کہ اپنوں کی تکلیف پر رودیں اور ضرورت آنے پر اپنا آپ ہار جائیں۔

نعیم کوثر سے ملیے : ۳۱ ر فردوس کاٹیج۔ شملہ ہلس بھوپال ۴۶۲۰۰۱۔ ایم۔ پی۔

موبائل: 09200000905

یہاں اقبال مسعو کے تحریر کردہ کوائف میں چند خوشگوار اضافے کیے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) جس کتاب سے مندرجہ بالا کوائف تحریر کیے ہیں وہ کتاب اقبال مسعود نے ۲۰۲۱ء میں ترتیب دے کر شائع کی ہے۔جس کا نام'' نعیم کوثر کی افسانوی کائنات'' ہے۔ اس میں کما بیش ۲۸ رمصنفین کی نعیم کوثر کے متعلق آراء شامل ہیں۔نعیم کوثر کو ۲۰۲۲ء میں دو اعزازات مزید حاصل ہوئے ہیں۔

پہلا'' شکھر سمّان''۔محکمہ ثقافت مدھیہ پردیش کی جانب سے ملک کے نامور افسانہ نگار، صحافی، ناقد اور محبّ اردو جناب نعیم کوثر کو ۲۰۱۹ء کے ''شکھر سمّان'' سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز انہیں حال ہی میں ۱۳ رفروری ۲۰۲۲ء کو بھارت بھون میں منعقد ایک تقریب میں دیا گیا۔

اور دوسرا انہیں اردو کے نامور شاعر، ادیب، افسانہ نگار، محقق، ناقد مظفر حنفی (مرحوم) کے نام سے جاری ہونے والا ایوارڈ'' مظفر حنفی عالمی اردو ایوارڈ'' ۲۰۲۲ء سے نوازا گیا۔

کوثر چاند پوری کی ادبی وراثت کو جس صاحبزادے نے جلا بخشی وہ نعیم کوثر ہیں نعیم کوثر کی ابتدائی تعلیم اجمیر بورڈ سے ہوئی جہاں سے ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں بی کام کیا۔ ان کی شادی ۱۹۵۹ء میں عبدالحمید قریشی کی صاحبزادی محترمہ عائشہ بیگم سے ہوئی نعیم کوثر مدھیہ پردیش ہاؤسنگ بورڈ بھوپال میں ایڈمنسٹریٹو افسر کی پوسٹ پر فائز رہے اس پوسٹ سے ۱۹۹۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے علاوہ کرکٹ کے سند یافتہ ایمپائر، بزم کارا اور مشعل ادب کے سکریٹری رہے۔ اور ۲۰۰۱ء سے پندرہ روزہ پرچہ ''صدائے اردو'' اپنی ادارت میں شائع کیا۔ عائشہ نعیم ریاضی اور عربی میں ایم۔اے ہیں شادی کے بعد مدرس کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ اس عہدے سے ۲۰۰۴ء میں ریٹائر ہوئیں اور ۲۰۰۴ء میں ہی انہوں نے اور نعیم کوثر نے حج کی سعادت حاصل کی۔ نعیم کوثر کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بڑی بیٹی روبینہ کوثر Msc پاس

ہیں اور لکچرار کے عہدے پر فائز ہیں ۔ دوسری بیٹی ڈاکٹر فردوس کوثر MS ماہرامراض چشم ہیں اور بیٹا نوید کوثر ایم ۔ کام کرنے کے بعد بینک میں ملازمت کر رہے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نعیم کوثر کا خاندان معاشی اعتبار سے خود کفیل ہے ۔

ادب سے وابستگی :

نعیم کوثر کا ذہن اپنے والد سید علی کوثر چاند پوری کے تخلیقی نظم وضبط سے ہمیشہ ہی متاثر رہا ۔ ان کو بچپن سے ہی اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا ۔ تخلیقی صلاحیت خداداد تھی اسی کے نتیجے میں محض ۱۲ سال کی چھوٹی سی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی کہانی ''یتیم بچّے کی عید'' لکھی جو ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ ''نونہال'' دہلی میں شائع ہوئی ۔ ۱۹۴۹ میں ایک طویل کہانی (ناولٹ) ''ہونہار شہزادہ'' لکھی جو حیدر آباد سے کتابی شکل میں شائع ہوئی ۔ ۱۹۵۰ء میں بچوں کے لیے لکھی گئی تقریریں الہ آباد سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں ۔ اور اسی سال پہلا معاشرتی افسانہ ''تشنگی'' ماہنامہ جمالستان دہلی سے شائع ہوا ۔

کوثر چاند پوری کے ادبی ذوق اور تخلیقی مزاج کے گہرے اثرات نعیم کوثر پر پڑے ۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق مزید پروان چڑھا اور کہانی لکھنا انکا مشغلہ بن گیا ۔ ادب کے ماہرین اور تنقیدی نگاہ رکھنے والوں نے ابتداء میں ہی ان کی صلاحیتوں کو محسوس کر لیا تھا اور یہ یقین دہانی کر دی تھی کہ وہ اپنے والد کی وراثت کو بہت آگے لے جائیں گے ۔ اس سلسلے میں اختر سعید خاں ۲۷ نومبر ۱۹۹۹ء کو نعیم کو تحریر کردہ ایک خط میں بے حد خلوص کے ساتھ فرماتے ہیں :

> ''تمہاری کتاب کی رسم اجراء کا دعوت نامہ کل شام کو ملا ۔ میرے قریب آؤ تمہیں گلے لگا کر پیشانی چوم کر مبارک باد دوں ۔ تم نے حکیم صاحب مرحوم کی وراثت کو اتنا آگے بڑھا دیا ہے کہ اہلِ بھوپال فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بھوپال کی سرزمین سے جنم لینے والا نعیم کوثر ہندوستان

کے ان چند افسانہ نگاروں میں ہے جن پر اردو زبان ناز کرتی ہے۔ اگر
ضرورت سے زیادہ بے نیاز اور شہرت سے بے تعلق نہ ہوتا تو افسانوی
ادب پر لکھے جانے والے ہر مضمون میں صف اوّل کے افسانہ نویسوں میں
اس کا نام جلی حرفوں میں لکھا ہوا پایا جاتا''۔[۱]

۱۹۵۰ء سے ۲۰۲۱ء تک افسانے تخلیق کرنے کے طویل سفر میں انھوں نے کم و بیش ۲۵۰ افسانے تخلیق کر لئے۔ ایک مدّت سے نعیم کوثر کے مختصر اور طویل افسانے ''بیسویں صدی''، ''رومان کراچی''، ''جمالستان دہلی''، ''تیغ دہلی''، ''فلم آرٹ میگزین''، ''آریہ ورت''، ''سریتا اردو دہلی''، ''صبا حیدرآباد''، عوامی دور دہلی''، ''آج کل''، ''نیا ورق''، ذہنِ جدید''، نیا دور''، سبق اردو'' جیسے معروف رسائل و جرائد میں شائع ہو کر نہ صرف عوام بلکہ مشاہیر علم و ادب سے داد و تحسین پاتے رہے ہیں۔ افسانے کے علاوہ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے جو وقفے وقفے سے آل انڈیا ریڈیو بھوپال کی اردو سروس سے نشر کئے گئے۔ ان ڈراموں میں نعیم کوثر نے صوتی اداکاری بھی کی۔

نعیم کوثر کا صحافت میں بھی ایک اہم مقام ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں بچّوں کا ماہانہ رسالہ ''جگنو'' بھوپال سے اپنی ادارت میں شائع کیا۔ صحافت میں ایک لمبے عرصے سے اچھے جرائد کی کمی شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ نعیم کوثر نے اس کمی کو پورا کیا اور ۲۰۰۱ء میں بھوپال سے نہایت بلند معیاری پندرہ روزہ جریدہ ''صدائے اردو'' جاری کیا۔ جو مسلسل ۱۶ سال تک بھوپال سے کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا اور ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر کے علاوہ امریکہ، انگلینڈ، ماریشس اور پاکستان کے اردو نواز ہاتھوں تک پہنچتا رہا۔

شخصیت:

کسی بڑے تخلیق کار کی تخلیق کا مطالعہ کرتے وقت اس کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کا مطالعہ

---

[۱] مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۹۹ء۔ کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص۔۳۱

کیا جانا ناگزیر ہوتا ہے ۔ کیوں کہ اس کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے اثرات اس کی تحریروں پر لازمی طور پر پڑتے ہیں ۔اس لئے مناسب ہوگا کہ نعیم کوثر کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے پہلے سوانحی حالات کے ساتھ ان کی شخصیت پر بھی نگاہ کرلی جائے ۔

نعیم کوثر مخلص، ہمدرد، نرم مزاج مگر پر جوش اور حق گو انسان ہیں ۔محفلوں میں بے تکلف گفتگو کرتے ہیں ۔ وہ ایک بے باک صحافی اور محبِ زبانِ اردو ہیں ۔اس سلسلے میں تلخ کلامی سے بھی نہیں چوکتے مگر کسی کا دکھ درد دیکھ کر نرمی پر اتر آتے ہیں ۔دوسروں کے غم میں ان کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں ۔

ادبی اعتبار سے بلند مقام پر فائز نعیم کوثر کی شخصیت بڑی پُرکشش اور پُر وقار ہے وہ ایک ادبی خاندان سے وابستہ ہیں جب کسی محفل میں جاتے ہیں تو اپنی بلند قامتی، پُر وقار نشست و برخاست گفتگو کے منفرد انداز سے محفل پر چھا جاتے ہیں ۔ان کا لب ولہجہ ان کا طنز یہ مزاحیہ انداز سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے ۔نعیم کوثر کے افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے مسیحا'' میں پروفیسر ظفر احمد نظامی کا مضمون ''نعیم کوثر ــــــــــــــــــــــــــــ ایک تعارف'' کے عنوان سے شامل ہے ۔جس میں پروفیسر ظفر احمد نظامی نے نعیم کوثر کی قلمی تصویر اس طرح کھینچی ہے :

> ''چہرہ کتابی، آنکھیں نیم خوابی، کشادہ پیشانی، ذہانت کی نشانی، لمبی ناک، زبان بے باک بڑے بڑے کان، خوش نصیبی کی داستان، سر پر سفید بال، ریشم کا جال ۔ یہ ہیں نامور قلم کار، ممتاز افسانہ نگار سیاح ممالک فکر و خیال، نازش و فخرِ ارض بھوپال حضرت کوثر چاندپوری کے فرزندِ ارجمند ۔ صاحب دل دردِ مند، حرفِ مستند و لفظ معتبر ــــــــــــــــــــ یعنی جناب نعیم کوثر'' ۔[1]

---

[1] ''خوابوں کے مسیحا ۔از ۔نعیم کوثر ۔ص ۔۵''

نعیم کوثر کی پیدائش اور حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ظفر احمد نظامی مزید لکھتے ہیں:

''نعیم کوثر نے ۱۵/دسمبر ۱۹۳۶ء کو بیگم گنج میں آنکھ کھولی، پیدا ہوتے ہی خوش بختی ان کے ساتھ ہولی، جہانگیریہ اسکول میں تعلیم پانے لگے، اپنی ابھرتی شخصیت کا لوہا منوانے لگے طلبہ کی یونین کے عہدہ یدار رہے، فنِ تقریر میں دھواں دھار رہے۔ حمیدیہ کالج سے بی۔ کام۔ کیا، خود کو مقبولِ خاص و عام کیا۔ پھر لکشمن ریکھا پار کر لی، سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ تعلیمی مشاغل سے ناطہ توڑا، ہاؤسنگ بورڈ سے رشتہ جوڑا۔ ہمدردی کا دم بھرنے لگے، بے گھروں کو گھر فراہم کرنے لگے۔ انتظامی صلاحیتوں میں طاق رہے، ہر فرد کے لئے باعث اشتیاق رہے۔ ہر ہر نگاہ کو دل سے عزیز ہوئے، ہر دل کے لئے خاصہ کی چیز ہوئے''۔[1]

ماہنامہ ''شاعر'' اردو کا مقتدر اور قدیم ترین پرچہ ہے۔ جسکی بنیاد سیماب اکبر آبادی نے رکھی تھی اور جس کا معیار بہت بلند ہے۔ افتخار امام صدیقی نے اس کا معیار گرنے نہیں دیا بلکہ اسے ہر اعتبار سے مکمل اور معیاری پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ماہنامہ ''شاعر کے خصوصی شمارے بھی نکالے گئے اور گوشے بھی۔ ماہنامہ ''شاعر'' کے اگست ۲۰۰۵ء کے شمارہ ۸ میں نعیم کوثر پر خصوصی گوشہ نکالا تھا جس کے ایڈیٹر افتخار امام صدیقی نے صفحہ اوّل پر ''نعیم کوثر۔۔۔۔ نقطے، دائرے، لکیریں'' کے عنوان سے جو عبارت تحریر کی ہے جس میں وہ نعیم کوثر کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قدرت کی صناعی کا مثالی خال وقد، مدھیہ پردیش کے آب و گل سے گندھا ہوا دراز قد، سوچ آنکھیں، خاموش لب لیکن حق گو، روح میں

[1] ''خوابوں کے مسیحا۔از۔نعیم کوثر۔ص۔۵''

روشنی ہی روشنی ، ذہن میں کائنات بھر ہلچل ، گندمی رنگ ، بالو میں وقت کی
سفیدی ، باسلیقہ پوشاک ، ہمہ رنگ ، حرف ولفظ کی امانت دار ، آدمیوں کی
بھیڑ میں ایک نمایاں چہرہ ، قلم کے بادشاہ ، خوددار لیکن مغرور نہیں ، انا آباد ،
زندگی کو صرف جینے کی حد تک جیا اور جی رہے ہیں ۔ مکالمہ پسند لیکن
استدلال کے ساتھ ، افسانے کو ہمیشہ کہانی دیکھنے اور اسے تخلیق کر کے
بتانے کا ہنر ، لہجے میں قدرے سفا کی مگر شہد کی سمائی بھی ، ہمدرد ، بہی خواہ ،
معاون ، عالم دانشور اور مذہبی بزرگوں کے لئے احترام ۔ گھر کی اپنی
تہذیب کے وارث ۔
یہ ہیں اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار حکیم کوثر چاندپوی کے
سپوت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نعیم کوثر'' [1]

نعیم کوثر بچپن سے اپنے والد کوثر چاندپوری کے علاوہ ان کے احباب ، اعلیٰ معیاری شعراء و ادباء کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے ۔ بھوپال کی بیش بہا ادبی محفلوں سے بھی وابستہ رہے ۔ وہ قدرتی طور پر بھی بے حد مخلص اور صدق گو انسان ہیں ۔ جس سے محبت کرتے ہیں سچّے دل سے ٹوٹ کر چاہتے ہیں ۔ پروفیسر محمد نعمان خاں صاحب کو نعیم کوثر نے ایک محبت سے بھرپور خط لکھا تھا جس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو نعمان صاحب نے جواباً تحریر کیا ہے ۔ جس پر ۱۷ ر دسمبر ۲۰۰۴ء تاریخ درج ہے ۔ خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے :

''بے پناہ اپنائیت اور مخلصانہ شکایت سے پُر نامہء محبت نظر نواز ہوا ۔ پڑھ کر
دل باغ باغ ہوا ۔ اپنی حماقت سے جس قدر ندامت محسوس ہوئی اسی قدر مسرّت

---

[1] ماہنامہ شاعر ۔ جلد ۷۶ ۔ شمارہ ۸ ۔ اگست ۲۰۰۵ء

آمیز حیرانی بھی کہ آج کے مادّی دور میں ہمیں یاد کرنے والے ہم سے شکایت
کرنے والے، ہماری گوشمالی کرنے والے الحمدللہ موجود ہیں۔ خدا ایسے مخلص کو
توقع سے زیادہ دنوں تک ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے، آمین!''[۱]

درحقیقت نعیم کوثر کی شخصیت میں وہ خلوص اور محبت شامل ہے کہ جو ان سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بارہا صدق گوئی میں ان کی زبان کڑواہٹ بھی اگل جاتی ہے۔ نعیم کوثر کے افسانوی مجموعہ ''اقرار نامہ'' میں مظفر حنفی اپنے مضمون ''حرفِ آغاز'' میں لکھتے ہیں:

''یادش بخیر ان سے میری دوبدو ملاقات کہیں ۱۹۶۰ء کے آس پاس
اختر سعید خاں کے دولت کدے پر منعقد حلقۂ دانشوراں (بھوپال) کے ایک
جلسے میں ہوئی جس کے اختتام پر آصف شاہمیری اس کے لئے کبیدہ خاطر نظر
آئے کہ میں نے ان کی کہانی کے متعلق کچھ تنقیدی سوال قائم کئے تھے۔
بھوپال کے بابائے اردو ایم۔ عرفان بھی کچھ خوش نہیں تھے۔ کیوں کہ میں نے
ان کے محبوب قلم کار اکرام اشعر کی پیش کردہ تخلیق پر چند اعتراض کر دیے
تھے۔ اس تقریب میں نعیم کوثر بھی موجود تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اپنی
خفگی کا اظہار کریں گے لیکن موصوف نے مجھے گلے لگاتے ہوئے اس جرأتِ
اظہار کی ستائش کی جس کا مظاہرہ میں نے کوثر چاندپوری صاحب کے
افسانے پر گفتگو کے دوران کیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ان پینتالیس
(۴۵) برسوں میں میرا بھائی مجھے ہر جا اور بے جا تحریر کی مسلسل داد دیتا رہا۔
اسے کہتے ہیں کردار کا استحکام اور وضعداری۔ خود ان میں جرأت اور حق گوئی

---

[۱] مورخہ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۴ء کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۱۸۶

کی کمی نہیں ہے۔اہلِ اقتدار کے سامنے انکی طرح تن کر کھڑے ہونے والے
اب بے حد کم ہیں''۔[1]

نعیم کوثر کی سنجیدہ، مخلص، وضعدار، پروقار اور قد آور شخصیت بھوپال کا گراں قدر سرمایہ ہے۔جن ادبی محفلوں میں وہ موجود ہوتے ہیں یا صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں ان محفلوں کو وہ پوری طرح سنوار دیتے ہیں۔ان کی وجہ سے نئے لکھنے والوں کو رہنمائی بھی ملتی ہے۔اور حوصلہ افزائی بھی۔انہوں نے بھوپال کے افسانہ نگاروں کو معیاری اور بلند مرتبہ افسانوں کی روایت سے روشناس کرایا۔خدا انہیں آسمانِ ادب پر تا دیر قائم رکھے اور وہ اسی طرح روشنی بکھیرتے رہیں۔

☆☆☆

---

[1] حرفِ آغاز۔مجموعہ ''اقرارنامہ''۔از نعیم کوثر۔صفحہ۔۹

باب چہارم

نعیم کوثر بحیثیت افسانہ نگار

نعیم کوثر بحیثیت افسانہ نگار

نعیم کوثر موجودہ دور کے صاحبِ طرز اور منفرد انداز کے افسانہ نگار ہیں۔ انکی شہرت اس جھیلوں کے شہر سے نکل کر ملک کے اہم ادبی مراکز میں بلکہ ہند و پاک کے نامور افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان کے افسانے حقیقت نگاری، سماج کی سچّی تصویر کشی، جذبات کا پُر اثر بیان، دورِ حاضر کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی سچّی نمائندگی کرتے ہیں۔

سرزمین بھوپال کے جن باکمال فنکاروں نے فکشن نگاری کے فن سے بھوپال کے ادب کو مالا مال کیا۔ ان میں نعیم کوثر کا نام سرفہرست ہے۔ اپنے والد کوثر چاند پوری سے میراث میں ملی فکشن کی روایت کو نعیم کوثر نے زندہ رکھا۔ نہ صرف زندہ رکھا بلکہ یہ صرف انھیں کا حصّہ ہے اپنے بہن بھائیوں میں یہ خوش نصیبی انھیں کا مقدر بنی کہ وہ اپنے والد کے نام کو ان کے فن کے حوالہ سے بلکہ اسے معراجِ کمال پر پہنچانے کے لئے مسلسل کوشاں ہیں۔ نعیم کوثر کے والد کوثر چاند پوری کیوں کہ ایک نامور ادیب اور طبیب تھے اور اپنے عہد کے نامور علماء اور ادباء سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ بھوپال میں آنے والے بیشتر مشاہیر ان کے گھر بھی تشریف لاتے ادبی محفلوں کا انعقاد ہوتا۔ اور جن میں نعیم کوثر بھی شریک رہتے عالمانہ اور ادبی گفتگو سے لطف اندوز بھی ہوتے ان کے ناپختہ ذہن پر یہ تمام اثرات ثبت ہوتے رہے۔ لہٰذا بچپن سے ہی اعلیٰ تہذیب، حسن و اخلاق اور وضعداری کے ساتھ ادب اور خاص طور پر فنِ افسانہ نگاری کے لئے ان کے ذہن کی تربیت میں معاوِن رہی۔

نعیم کوثؔر بچپن سے ہی بے حد ذہین اور حساّس تھے۔ انھیں مطالعہ کا شوق ابتداء سے ہی تھا جو آج تک قائم ہے۔ وہ مطالعہ دلچسپی اور گہرائی سے کرتے ہیں۔ جوخوبیاں یا خرابیاں انھیں نظر آتی ہیں ان پر بیباک تبصرہ کرنا بھی ان کی عادت ہے۔ انھوں نے جب افسانہ لکھنے کی ابتداء کی تو اپنے والد کے علاوہ اس دور کے اور بھی اہم افسانہ نگاروں کے فن پاروں کا عمیق مطالعہ کیا۔ افسانہ کے فن پر مہارت حاصل کی اور یہ بھی محسوس کیا کہ ایک اچھے تخلیق کار پر سماج کی کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ نعیم کوثؔر اپنے والد کوثر چاند پوری کے ساتھ ساتھ ابتداء سے ہی پریم چند سے بھی متاثر رہے۔ منشی پریم چند ہی درحقیقت وہ ادیب ہیں جن کے افسانے پڑھ کر انھیں اپنے اندر ایک قلمکار انگڑائیاں لیتا ہوا محسوس ہوا۔ انہوں نے غریب اور مظلوم انسانوں کے زندہ کرداروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔

بچپن ہی سے فن پر ان کی گہری پکڑ تھی ۱۹۴۸ء میں نعیم کوثر نے پہلی کہانی ''یتیم بچّے کی عید'' لکھی جو دہلی سے شائع ہونے والے بچّوں کے اردو ماہنامہ ''نونہال'' میں شائع ہوئی تھی اس کہانی کی اشاعت نے انھیں بڑا حوصلہ دیا۔ وہ باقاعدہ کہانیاں لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں جب کہ ان کی عمر ۱۳ سال تھی بچوں کے لئے ایک طویل کہانی ناولٹ کی شکل میں ''ہونہار شہزادہ'' لکھی جو حاتمی پبلشنگ ہاؤس حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ اور اس طرح محی الدین اختر، نعیم کوثؔر کے قلمی نام سے مشہور ہونے لگے۔ بچّوں کے لئے کہانیاں لکھنے کے بعد انھوں نے اپنا پہلا معاشرتی افسانہ ''تشنگی'' لکھا جسے ۱۹۵۰ء میں دہلی کے ماہنامہ ''جمالستان'' نے شائع کیا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ساتھ میں افسانہ نگاری کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ صحافت پر بھی توجہ تھی۔ ۱۹۵۲ء میں انٹر کالجیسٹ مقابلے میں نعیم کوثر کو ان کے افسانے ''تشنگی'' پر تیسرا انعام ملا۔ ان کی کہانیاں اب تواتُر سے ہندوستان کے نامور ماہناموں میں شائع ہونے لگیں۔

نعیم کوثر کی ابتدائی تحریروں کو دیکھ کر شروع سے ہی یہ اندازہ لگایا جارہا تھا کہ آگے چل کر یہ نو عمر ادیب اردو ادب کی دنیا میں کامیاب ادیب اور افسانہ نگار ثابت ہوگا۔ نعیم کوثر کے افسانوں کے مجموعے ''خوابوں کے مسیحا'' کے سرورق پر ملک کے نامور افسانہ نگار اقبال مجید (مرحوم) نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''۱۹۶۲ء میں ''صبا'' حیدرآباد میں نعیم کوثر کی کہانی ''نئی صبح'' پڑھی تو ذہن میں گدگدی سی ہوئی۔ چلو اچھی کہانی لکھنے والوں کی صف میں ایک نوجوان قلم کار کا اضافہ ہوا جو بنیادی طور پر ترقی پسند اور سیکولر مزاج کا ہے۔ جب آل انڈیا ریڈیو بھوپال آیا تو پتہ چلا کہ یہ کہانی کار تو نامور افسانہ نگار جناب کوثر چاندپوری کے صاحبزادے ہیں۔ صدر منزل میں ''افسانے کی محفل'' کا انعقاد ہوا۔ عصمت چغتائی اور راقم الحروف کے علاوہ نعیم کوثر نے بڑی خوبصورت کہانی ''نئے آدم کی چتا'' سنائی۔ حاضرینِ جلسہ کے علاوہ عصمت آپا نے بھی کئی بار ''واہ'' ''واہ'' کہا۔ نعیم کوثر آل انڈیا ریڈیو سے بھی بہترین کہانیاں پڑھتے ہیں''۔[1]

نعیم کوثر کے افسانوں کے دو مجموعوں کے طبع ہونے کے بعد اقبال مجید ان کی رفتار میں تیزی اور شہرت میں اضافے کی کمی کو ان پرخلوص الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''نعیم کوثر اگر چہ کوثر چاندپوری کے صاحبزادے ہیں لیکن انہوں نے افسانے کے صنفی وقار اور اس کی افزائش کے لئے اپنے شوق کو اس یک سوئی، ذوق اور توجہ کے ساتھ دانا پانی نہیں دیا جیسے مسلسل انہماک کے

---

[1] سرورق ''خوابوں کے مسیحا''۔ از۔ نعیم کوثر

ساتھ برسوں ان کے والد نے دیا تھا۔ اگر چہ ان کے افسانوں کے دو مجموعے منظرعام پرآ چکے ہیں یہ کمائی پچھلے ۴۵ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے جس سے ان کی رفتار کا اندازہ ہوسکتا ہے۔لیکن وقت کسی کی رفتار پر رحم کھا کر ساتھ نہیں دیتا اس کی خود اپنی الگ رفتار ہوتی ہے جو اکثر بڑی سفاک ہوتی ہے اور ہم جیسے نہ جانے کتنے کو گرد کارواں بنا کرآگے بڑھ جاتی ہے۔ بھوپال کے ان افسانہ نگاروں میں کئی نام ہم کو ایسے بھی ملیں گے جن کی تخلیقات ہندو پاک کے رسائل میں شائع بھی ہوتی رہی ہیں نعیم کوثر بھی اُن میں سے ایک ہیں لیکن افسانے کی صنف میں اپنی دیرپا چھاپ چھوڑ جانے کا کام ان میں سے کتنے کر سکتے ہیں جب یہ سوچتا ہوں تو یہ ضرور خیال آتا ہے کہ اس کی ذمہ داری اس سنگ لاخ زمین پر بھی عائد ہوتی ہے۔جس کے یہ پروردہ ہیں۔ بہر حال اس کے باوجود یہی کیا کم ہے کہ افسانوی ادب کے اس پرشکوہ مینار پر، مرجھائے ہوئے ہی سہی نعیم کوثر بھی ہمارے ساتھ اپنی عقیدت کے پھول کبھی کبھی چڑھاتے رہتے ہیں۔''[۱]

اسی دور میں ایک پرچہ'' آریہ ورت'' نکلتا تھا۔''آریہ ورت'' وہ ماہنامہ تھا جو عوام کے ذوق کو پیشِ نظر رکھ کر کہانیاں شائع کرتا تھا۔ یہ کہانیاں پڑھنے والے کو جنسی لذّت اور ہوسناکی کو مزید ہوا دیتی تھیں۔نعیم کوثر نے اس ماہنامہ کے عام لکھنے والوں کی سستی شہرت سے متاثر ہوکر اسی مزاج کا افسانہ''ننگی عورت'' لکھا جو ایسا افسانہ تھا جس میں جنسی لذّت اور کافی حد تک عریانیت تھی ۔ ماہنامہ آریہ ورت کے شمارے میں یہ افسانہ شائع ہوا۔اس کے عام قاری کو کیف وسرور جنسی لذّت کوشی کے حصول کا سبب بنا اور پسندیدہ قرار پایا۔لیکن جب یہ افسانہ نعیم کوثر کے والد کوثر چاند پوری کی نگاہ سے

---

[۱] نعیم کوثر کی افسانوی کائینات۔مرتب اقبال مسعود۔ص ۲۷

گزرا تو وہ سخت برہم ہوئے۔ چونکہ نہ تو گھر کا ماحول اس قسم کا تھا اور نہ سید علی کوثر چاند پوری نے اپنے کسی افسانے یا کہانی میں ایسا ماحول یا کردار پیش کیا تھا۔ ان کے افسانے بلند معیاری ہوتے تھے جنکا ماحول پاکیزہ ہوتا تھا۔ جو عام مہذّب ماحول اور پردہ دار گھرانوں میں بھی شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ اس کہانی کو پڑھ کر انہوں نے بیٹے کی سرزنش کی اور کافی عرصہ ان سے ناراض رہے اب نعیم کوثر کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے ایسی کہانیاں لکھنے سے توبہ کر لی۔ لیکن جیسے جیسے شعور بالغ ہوتا گیا۔ ان کی فکر اور ادراک میں بھی سنجیدگی آتی گئی اور انہوں نے سماج اور زندگی میں رونما ہونے والے تغیرات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے زمانے کے بدلتے مزاج کو افسانوں کا موضوع بنایا اور ایسے افسانے تخلیق کئے جو عصری مسائل اور سماج کے نمائندہ کہے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں افسانوی رنگ، فنی خوبیاں اور فکری عنصر بھی ہے۔ ان کے افسانے خَلا میں پیدا نہیں ہوتے اور نہ صرف جذبات کا اظہار ہیں۔ بلکہ ان کے افسانوں میں سماج کی سچّی عکاّسی ہے۔ نئے حالات کے زیرِ اثر سماج میں پیدا شدہ مسائل کا بیان بھی ہے اور بے کس مظلوم انسانوں کے جذبات کا اظہار بھی اور اچھے مستقبل کی جدوجہد بھی اور مشکل حالات سے ابھارنے کی رہنمائی بھی ہے۔

نعیم کوثؔر کی ہمہ جہت شخصیت، فن پر ان کی زبردست پکڑ، افسانہ نگاری میں ان کی اعلیٰ خدمات اور خداداد صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے افسانوں کے مجموعے ''اقرار نامہ'' کے پیش لفظ میں مشہور محقق اور ناقد رشید حسن خاں نعیم کوثر کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کہانی پن نعیم کوثر کے افسانوں میں شروع ہی سے بنیادی حیثیت
> سے شامل رہا ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی افسانہ نگار کے سب افسانے ایک سطح
> کے نہیں ہوتے، شاید ہو بھی نہیں سکتے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ چند
> افسانوں میں بھی زندگی کی کسی جہت کی ترجمانی سلیقے کے ساتھ ہوگئی ہو تو

افسانے لکھتے رہنے کا جواز باقی رہتا ہے۔نعیم کوثر کے کئی افسانوں میں یہ خوبی نمایاں نظر آتی ہے۔

وہ بھوپال میں رہتے ہیں جو اب سے کچھ عرصے پہلے تک ایک ریاست تھی، ناعاقبت اندیش ریاستی امراء کا جو برا حال ہوا، اس سے ہم سبھی واقف ہوں گے۔ میں نے جب ان کا افسانہ ''کال کوٹھری'' پڑھا تو اس بدلے ہوئے زمانے میں اس ریاستی معاشرے کے خوش حال افراد کی تباہ حالی کی دل دکھانے والی تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔اسی طرح ایک دوسرے مجموعے میں شامل افسانے ''اہرام'' میں اسی معاشرت کی ایک ذرا مختلف تصویر سامنے آ جاتی ہے اور یہ بھی دل دکھانے والی ہے، یوں کہ حقیقی زندگی کی کہانی ہے۔اس افسانے میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہندوستان میں بھولے بھٹکے کمیونزم آیا بھی تو ماتھے پر قشقہ لگا کر ہی آئے گا۔کیسی تہہ دار بات کہی ہے۔افسانہ نگار نے، سچّی اور دوٹوک۔اس جملے کے پہلے ٹکڑے ''ہندوستان میں بھولے بھٹکے کمیونزم آیا بھی میں'' آیا بھی'' کی گہری معنویت قابلِ داد ہے''۔[۱]

نعیم کوثر کے افسانے کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال مسعود کی مرتب کردہ کتاب ''نعیم کوثر کی افسانوی کائینات''، میں شامل اپنے مضمون ''نعیم کوثر: شخص وعکس''، میں ڈاکٹر محمد نعمان خاں رقمطراز ہیں:

''نعیم کوثر کے فن کی بنیاد افسانویت اور ارضیت پر استوار ہے۔ انہوں نے اپنے ماحول سے ہی موضوعات اخذ کئے ہیں۔ جب تک ان کا

---

۱ پیش لفظ۔اقرارنامہ۔ازنعیم کوثر۔ص۸

مشاہدہ، تجربہ نہیں بن جاتا، وہ قلم نہیں اٹھاتے ہیں۔ زبان کا رچاؤ، کہانی کہنے کا ڈھنگ، تہذیبی اقدار کی پاسداری، انسان دوستی، رشتوں کا احترام ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ زندگی اور سماج کے حقیقی رنگ و روپ کو افسانوں میں ڈھالنا اور فنی ہنرمندی کے ساتھ ترسیلی عمل سے گزارنا آسان کام نہیں ہے۔ اچھے اچھوں کو اس آگ کے دریا میں ابھرتے ڈوبتے ہاتھ پاؤں مارتے اور پھر قعرِ دریا ہی میں تہہ نشیں ہوتے دیکھا گیا ہے۔ یہاں ایسی شناوری درکار ہوتی ہے جو شناور کو نشیب و فراز کے بھنور سے گزارتے ہوئے بہ سلامت روی کنارے تک پہنچا سکے۔

بلا شبہ نعیم کوثر افسانوی سمندر کے ان چند مشاق شناوروں میں شامل ہیں کہ جنہوں نے اردو افسانے کا بیڑا پار لگانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔''[1]

نعیم کوثؔر کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے مسیحا'' ۱۹۹۹ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں کل ۲۰/افسانے ''نئی صبح''، ''مردانگی''، ''ریلوے والے پیر''، ''دہلیز''، ''برف کے پھائے''، ''کوہ قاف کا شہزادہ''، ''الہ دین کا چراغ''، ''نئے آدم کی چتا''، ''مقدّس رشتہ''، ''رگِ جاں کا لہو''، ''خدا بڑا کارساز ہے''، ''فرعون کا اہرام''، ''اپاہج یاترا''، ''وہ گلستاں ہمارا''، ''سکندر''، ''وقت کی یلغار''، ''خوابوں کے مسیحا''، ''نئی الف لیلیٰ''، ''دیمئنٹر'' اور ''بھوکتے رہو'' وغیرہ افسانے شامل ہیں۔

نعیم کوثر کے زیادہ تر افسانے غریب مزدور اور بے کس انسانوں کا استحصال، سماجی نا

---

[1] نعیم کوثر کی افسانوی کائنات۔ مرتب اقبال مسعود۔ ص ۴۶

برابری اور ناانصافی نظام پر بھرپور چوٹ کرتے ہیں۔

ان کے افسانے فنی پختگی کے ساتھ نئے مسائل پر گہری نگاہ کے سبب ادب میں نمایاں مقام حاصل کرتے ہیں۔ملک کے مشہور محقق اور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی (مرحوم) مشاہیر کے خطوط کے مجموعے ''لفظ شناس'' میں شامل ۷ نومبر ۱۹۹۹ء کے نعیم کوثر کو تحریر کردہ اپنے خط میں لکھتے ہیں:

> ''خوابوں کے مسیحا'' کا ایک نسخہ ملا شکریہ
>
> آپ کا مجموعہ بہت صاف ستھرا چھپا ہے۔کئی افسانے میں نے پڑھے اور زبان پر آپ کی مہارت کی داد دی۔بعض موضوعات بھی اچھوتے ہیں۔ میں آپ کے والد بزرگوار کے نیازمندوں میں تھا۔ یہ تعلق میرے تاثر کو اور گہرا کر گیا''۔[۱]

مشہور فکشن نگار اور مصنفہ محترمہ عفّت موہانی کے دو خط مشاہیر کے خطوط کے مجموعہ لفظ شناس میں شامل ہیں یہ وہ خطوط ہیں جو وقتاً فوقتاً نعیم کوثر کے نام مشاہیر نے لکھے تھے۔ ۷ ستمبر ۱۹۹۹ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ ایک خط میں عفّت موہانی لکھتی ہیں:

> ''میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی کہانی یا افسانہ لکھنے کے لئے قلم اٹھانے سے پہلے اس کے مقصد اور موضوع کو سامنے رکھنا چاہئے، کہانی اس زُمرے سے اس لئے خارج ہو جاتی ہے کہ اس کا ربط نانی دادی اور ان کے نواسوں سے ہے۔ایک مقصد اس کے لیے بھی ضروری ہوتا ہے لیکن افسانے کا معاملہ اور ہے۔اس کے لئے ہیئت، تکنیک اور دوسرے دلچسپ پلاٹ سے ہے۔اس کے لیے ابتدا، انتہا اور کلائیمکس کا لزوم اس درجہ اہمیت کا حامل ہے جس کے

۱؎ ''لفظ شناس''۔مرتبہ رشید انجم۔ص۔۳۲

بغیر افسانے کو مکمل ، با مقصد اور دلچسپ افسانہ کہنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے اور اس نوعیت کے افسانے وقتاً فوقتاً ہی مطالعے میں آتے ہیں۔ فی الحال معدودے چند افسانہ نگار تحریر کے اس کینواس پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں ایک نام آپ کا ہے۔ ''خوابوں کا مسیحا'' اگر تعبیر میں بھی فی الواقع مسیحا نفس ثابت ہوتا ہے تو افسانہ نویس اپنے مقصد میں بالکل کامیاب ہے۔ جیسے آپ کامیاب رہے ہیں۔ سارے افسانے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی ان افسانوں کا تحیر خیز اختتام ہے، سب سے زیادہ پسند آنے والی چیز یہی ہے''۔[1]

نعیم کوثر کے افسانوں پر اکثر مشاہیر نے اپنے خطوط کے ذریعہ اظہار رائے کی ہے۔ ان میں ماہ نامہ ''شاعر'' کے نائب مدیر مظہر امام کا خط مشاہیر کے خطوط کے مجموعے ''لفظ شناس'' میں شامل ہے۔ وہ اپنے ۵ نومبر ۱۹۹۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''میں آپ کو اس مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور شکر گزار ہوں کہ آپ نے ان افسانوں کو پڑھنے کا موقع دیا۔ یقیناً کئی افسانے پڑھے ہوئے ہونگے ، مگر اب ذہن میں محفوظ نہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر ایک نیا لطف حاصل ہوا۔ زبان و بیان کے علاوہ مسائلِ حیات پر آپ کی گرفت مضبوط ہے اور ان افسانوں میں ایک ایسی دردمندی ہے جو آج کی کہانیوں میں معدوم ہوتی جا رہی ہے''۔[2]

---

[1] مورخہ ۷ر ستمبر۔ ۱۹۹۹ء کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب۔ رشید انجم۔ ص۔ ۴۸

[2] مورخہ ۵ر نومبر ۱۹۹۹ء کا مطبوعہ خط ''لفظ شناس''۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۵۲

ایک ایسا ہی خط جوان کے افسانوں پر تبصرے کی خاطر لکھا گیا ہے نشتر خانقاہی کا بھی ہے ۔ وہ ۲۹ رمئی ۲۰۰۷ء کو اپنے خط میں نعیم کوثر کو لکھتے ہیں :

''افسانوی تحریروں کو پرکھنے کی میرے پاس ہمیشہ یہ کسوٹی رہی ہے کہ اگر اس میں کہانی پن نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے ۔موضوع اور دوسرے واقعے میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ۔مصنف کی حیثیت سے موضوع آپ کے لئے اولین شرط ہوسکتی ہے، قاری کی حیثیت سے میرے لئے نہیں کیوں کہ کہانی میں، میں پہلے کہانی تلاش کروں گا، دوسری چیزیں بعد میں ۔اس کسوٹی پر آپ کے زیادہ تر افسانے کھرے اترے ۔ پڑھنے والے کو باندھ کر رکھنے کا آرٹ آپ میں ہے، نثر رواں دواں ہے ۔''وقت کی یلغار'' ''بھونکتے رہو''، ''نئی صبح'' اور ''برف کے پھائے'' فن کے اچھے نمونے ہیں ۔میری تشفی اس بات سے بھی رہی کہ آپ نے جدیدیت کا جال بن کر افسانے کو چیستاں بنانے سے گریز کیا ہے'' ۔[۱]

نعیم کوثر کے ہم عصر افسانہ نگاروں کی رائے نعیم کوثر کے افسانوں سے متعلق خصوصی اہمیت کی حامل ہے بقول کالی داس گپتا رضا ۲۰ رنومبر ۱۹۹۹ء کے خط میں لکھتے ہیں :

''خوانوں کے مسیحا'' ملی ۔لیکن مصروفیت اور ضعیفی کی وجہ سے اب افسانے نہیں پڑھتا ۔مگر آپ کے دو افسانے پڑھے
''ریلوے والے پیر'' اور ''دہلیز''
آپ یقیناً کشادہ دل اور بیدار ذہنیت کے افسانہ نگار ہیں ۔دیر تک لطف لیتا رہا'' ۔[۲]

---

[۱] مورخہ ۲۹ رمئی ۲۰۰۷ء کا مطبوعہ خط ''لفظ شناس'' ۔مرتب ۔رشید انجم ۔ص ۶۰۔۶۱

[۲] مورخہ ۲۰ رنومبر ۔۱۹۹۹ء کا مطبوعہ خط ۔لفظ شناس ۔مرتب رشید انجم ۔ص ۔۴۷

نعیم کوثر کے یوں تو تمام افسانے قاری کوشروع سے آخر تک باندھے رکھتے ہیں ۔لیکن اس مجموعے کے دو افسانے ’’دہلیز اور ’’سکندر‘‘ سیدھے دل پر اثر کرتے ہیں ۔

نعیم کوثر کا افسانہ ’’دہلیز‘‘ فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر لکھا گیا بہترین افسانہ ہے ۔جس کے ذریعہ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی سچّی تصویر کشی کی ہے ۔ ہمارا ملک ہمیشہ سے ہی گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے ۔ یہاں سبھی مذاہب کے لوگ سکھ دکھ اور اچھے برے حالات میں ایک دوسرے کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں ۔اس افسانے میں نعیم کوثر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہیں تو کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے پڑوس میں رہنے والے دوسرے مذاہب کے لوگوں کی بلاتفریقِ مذہب حفاظت کرتے ہیں ۔انہیں فرقہ واریت کے جنون سے بچاتے ہیں ۔جس سے ہمیں انسانیت دوستی اور بھائی چارے کا پیغام ملتا ہے اور ایسے لوگوں سے نفرت ہوتی ہے جو مذہب کے نام پر سماج کو بانٹنے کا کام کرتے ہیں ۔ بھولے بھالے لوگوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بوتے ہیں ۔افسانے کا خلاصہ درج ذیل ہے :

راجدھانی کے ڈویژن کمشنر قبائلی تحصیل کے ہیڈ کوارٹر کے تحصیلدار کی شکایت موصول ہونے پر جانچ کرنے کے لئے ڈپٹی کلکٹر کو بھیجتے ہیں ۔ ڈپٹی کلکٹر کو اسٹیشن پر لینے وہی تحصیلدار اور دو نائب تحصیلدار آتے ہیں اور ڈپٹی کلکٹر کو شیشے میں اتارنے کے لئے کوششیں شروع کر دیتے ہیں طرح طرح سے آؤ بھگت کرتے ہیں تحصیلداران کے ٹھہرنے کا انتظام پاس کے ہی ایک بنگلہ میں کروا دیتا ہے ۔ رات میں ڈپٹی کلکٹر ریڈیو پر خبریں سن رہا ہوتا ہے ۔اسے معلوم ہوتا ہے کہ راجدھانی میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہے اور پورے شہر میں تشدّد کا بازار گرم ہے ۔اسے اپنی بیوی اور بچّوں کی بے حد فکر ہوتی ہے ۔ دوسرے دن تحصیلدار کی گاڑی سے ہی ڈپٹی کلکٹر اپنے شہر روانہ ہو جاتا ہے ۔راستے میں طرح

طرح کے خیالات آتے ہیں وہ سوچتا ہے کہ ہمارے محلے میں تو ایسے لوگ نہیں ہیں اور پڑوس میں ہیڈ کانسٹبل اکرم شاہ بھی رہتے ہیں جو نہایت نیک نمازی اور پرہیز گار انسان ہیں مگر ریڈیو پر آنے والی خبریں بھی تو جھوٹی نہیں ہیں ہر طرف آگ اور خون کا بازار گرم ہے جانے میرے گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ جب وہ اپنے محلے میں پہنچتا ہے تو وہاں جا کر دیکھتا ہے کہ اسکا گھر بھی نذرِ آتش ہو چکا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ چکرا کر گر پڑتا ہے اور اپنے بیوی بچّوں کو آواز لگاتا ہے۔تبھی پڑوس سے اکرم شاہ کی بیوی کی آواز آتی ہے۔ بھائی صاحب گھبرائیں نہیں بھابی اور بچّے ہمارے گھر پر ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر خوشی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔شدید صدمے میں خوشی کی خبر سن کر اسکا کیا حال ہوتا ہے اسے نعیم کوثر نے اس طرح بیان کیا:

''بھائی صاحب گھبرایئے نہیں آجایئے۔ بھابی اور بچے یہاں ہیں۔''

اسے محسوس ہوا جیسے اکرم شاہ کی بیوی کی آواز نے اس کے بے جان جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی ہو۔اور وہ خوشی میں دیوانہ وار اکرم شاہ کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔اس کی بیوی کملا نے دروازہ کھول کر اس کا ہاتھ تھام لیا وہ آہستہ سے اُٹھا اور سر جھکا کر دہلیز کو اپنی نم آنکھوں سے یوں دیکھنے لگا جیسے وہاں نایاب اور قیمتی جواہرات بکھرے پڑے ہوں جن کی آب وتاب مندروں اور مسجدوں کے سنہری کلسون کو ماند کر رہی تھی''۔ [1]

اسی طرح نعیم کوثؔر نے افسانہ ''سکندر'' میں ایک ایماندار استاد ماسٹر کبیر داس کا قصّہ بیان کیا ہے۔ جو اپنی تیس سالہ تدریسی ملازمت کے دوران ایمانداری اور محنت سے بچّوں کو تعلیم دیتے رہے۔ سرکاری تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ گھر کا خرچ آسانی سے چل سکے اس لئے وہ گھر پر بھی بچّوں کو ٹیوشن پڑھایا

---

[1] ''خوابوں کے مسیحا'' از نعیم کوثر۔ص۴۴

کرتے تھے۔ان کا جوان بیٹا نرنجن بھی انکی تربیت اورمحنت سے پڑھ لکھ کر بی۔اے پاس ہوگیا تھا اور نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔سخت محنت اور دوڑ دوپ کے بعد بھی نوکری حاصل نہیں کر پایا۔جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان اور ناامیدی کا شکار تھا۔ماسٹر جی کو بھی اسکی نوکری کی بے حد فکر تھی دفتروں کے چکر لگا لگا کر اپنے بیٹے نرنجن کے لئے نوکری تلاش کررہے تھے۔ساتھ ہی وہ نرنجن کو امید دلاتے ہیں کہ بیٹا اتنی جلدی ہمت نہیں ہارا کرتے ہر چیز اپنے مقررہ وقت پر ملتی ہے۔

ایک دن جب وہ گھر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ نرنجن اپنی ماں سے کہتا ہے کہ سارے زمانے کو نوکریاں مل رہی ہیں۔کوئی میرے لئے کچھ نہیں کرتا۔کیا میں زہر کھا کر مرجاؤں۔ماسٹر جی سمجھتے تھے کہ خاموشی سے ہی ان سب حالات سے نکلا جا سکتا ہے۔لیکن ان کی بیوی کہتی ہے کہ تم کبیر داس سے سورداس بن جاؤ گے اور بری طرح سے ماسٹر جی سے جھگڑا کرتی ہے۔دوسرے دن کبیر داس اپنے دوست کے لڑکے کی شادی میں جاتے ہیں۔وہیں بھوپال گیس ٹریجڈی کے شکار ہو جاتے ہیں۔کسی طرح سے ماسٹر جی اپنے گھر آجاتے ہیں مگر انکی آنکھوں کی روشنی چلی جاتی ہے۔انکی بیوی ہمت دیتی ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔اتنے میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر آجاتے ہیں اور کبیر داس سے سرکار کی طرف سے آنے والے سرکلر کا ذکر کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ زہریلی گیس سے اگر کسی سرکاری ملازم کی موت ہوگئی ہے تو اسکے گھر کے تعلیم یافتہ فرد کو نوکری پر رکھ لیا جائے گا۔نرنجن وہ سرکلر ہیڈ ماسٹر سے لے لیتا ہے جیسے ہی وہ اسکے ہاتھ میں آتا ہے اسے ایسا لگتا ہے جیسے اسے نوکری کا پروانہ مل گیا اور وہ اپنے باپ کو زہر دے دیتا ہے۔پھر اسے باپ کی جگہ سرکاری نوکری مل جاتی ہے۔

اس افسانے کے ذریعے نعیم کوثر نے ملک کے بے روزگار نوجوانوں کی کیفیت اور ذہنی انتشار کو ظاہر کیا ہے۔کہ ہمارے ملک کے جوان پڑھ لکھ کر بھی روزگار کے لئے بھٹکتے ہیں۔ان کے دل سے

مقدس اور قلبی رشتوں کی بھی اہمیت ختم ہو جاتی ہے وہ اس قدر سنگ دل اور خود غرض ہوتے جا رہے ہیں۔مگر جہاں ایک طرف اس افسانے میں بے روزگاری جیسے سماج کے ناسور کو ظاہر کیا ہے وہیں نوجوان بیٹوں کو کوئی بہتر میسیج نہیں دیا۔

''خوابوں کے مسیحا'' کی اشاعت کے تین سال بعد مکتبہ''صدائے اردو'' پبلیکیشنز نے بھوپال سے نعیم کوثر کا دوسرا افسانوی مجموعہ'' کال کوٹھری'' نومبر۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔اس مجموعے کو نعیم کوثر نے اپنے والد بزرگوار جناب کوثر چاند پوری (مرحوم) اور اپنے دوست اقبال مجید (مرحوم) کے نام معنون کیا تھا۔۱۶۳صفحات کے اس مجموعے میں کل ۱۹ افسانے ہیں۔''حویلی کا مرہم''، ''انمول رتن''، ''تیاگ''، ''سمجھوتا''، ''ایل۔پی۔جی''، ''مکتی''، ''جوتے کا پیڑ''، ''اُلٹی دھار''، ''آخری سفر''، ''نئی گئو شالہ''، ''ایلیفنٹا کا ہاتھی''، ''کفّارہ''، ''اللہ کا گھر''، ''پہلی اڑان''، ''تخمِ گمشدہ''، ''پہلی کمائی''، ''انا کی جیت''، ''وردان'' اور'' کال کوٹھری'' اس مجموعے میں ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی کی معاون مدیر ڈاکٹر شمع افروز زیدی کا مضمون''نعیم کوثر اور ان کا فن'' کے عنوان سے شامل ہے۔

نعیم کوثر کا افسانوی مجموعہ'' کال کوٹھری'' شائع ہوا تو اکثر اہم فکشن نگاروں نے اپنی رائے سے نوازا۔نعیم کوثر دکھی انسانوں کے درد کو اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور کرداروں کے ذریعہ زندہ انسانوں کے درد کو بڑی اثر انگیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ان کے بیان کی سچّائی اور کھرا پن ہر کسی کو متاثر کرتا ہے۔انسانی نفسیات پر انکی گہری نگاہ ہے اور ان کا مشاہدہ وسیع ہے اس سلسلے میں نعیم کوثر کے افسانوی مجموعے'' کال کوٹھری'' میں شمع افروز زیدی اپنے مضمون بعنوان''نعیم کوثر اور ان کا فن'' میں نعیم کوثر کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''نعیم کوثر کی کہانیاں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے جاگتے لمحوں کو نہ صرف دیکھا ہے پرکھا اور محسوس کیا ہے بلکہ انہیں اپنی روح میں اتارا اور جھیلا بھی ہے۔ ان کے افسانوں کے متنوع موضوعات اور کرداروں کی اہمیت انسانی زندگی میں عارضی نہیں بلکہ ان کی سچائی اور کھرا پن ہر زمانے کے لئے ہے جنہیں پڑھ کر ان کے مشاہدے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے پاس خوبصورت الفاظ کا ایسا ذخیرہ ہے جسے وہ خوب سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ دراصل وہ الفاظ کے رتن ایسی مناسبت سے جڑتے ہیں کہ جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں کیوں کہ انہوں نے جگہ اور حالات کے مدنظر لفظوں کو بڑی موزونیت سے جڑ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ لفظ کس کس طرح اپنے معنی بدلتے ہیں''۔[۱]

نعیم کوثر کے اس افسانوی مجموعہ کے سرورق پر ڈاکٹر محمد نعمان کی خان کی رائے درج ہے جس میں وہ نعیم کوثر کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نعیم کوثر کی کہانیوں کا سب سے نمایاں وصف یہی ہے کہ ان پر فنکار کی انفرادیت کی گہری چھاپ دیکھی جاسکتی ہے اور ان کے افسانوں کی خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں کسی قسم کے تقلیدی رنگ کے بجائے افسانہ نگار کے مشاہدات و تجربات کی آنچ محسوس کی جاسکتی ہے''۔[۲]

نعیم کوثر جو دیکھتے ہیں اسے پُر اثر انداز میں بیان بھی کر دیتے ہیں ماحول، واقعات اور

---

۱ ''نعیم کوثر اور ان کا فن'' مطبوعہ۔ کال کوٹھری۔ از نعیم کوثر

۲ سرورق۔ ''کال کوٹھری'' از نعیم کوثر

کرداروں کی فطرت سبھی کچھ ان کی گہری نگاہ کی غمّازی کرتی ہیں۔اس سلسلے میں مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ''لفظ شناس''میں جوگندر پال اپنے ۲۱ر جون ۲۰۰۲ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ ایک خط میں اپنی رائے اس طرح دیتے ہیں:

''آپ کے یہاں وقوعی تانا بانا بڑا پکّا ہوتا ہے جس کے باعث کہانی خوب بندھ جاتی ہے اور متاثر کرتی ہے۔اکثر مقامات پر بہت زیادہ''۔[۱]

نعیم کوثؔر کے نام مشاہیر کے تحریر کردہ خطوط کا مجموعہ''لفظ شناس''میں صفحہ ۱۴۵ پر ملک کے نامور شاعر ندا فاضلی کا خط شامل ہے۔اس خط میں انہوں نے تاریخ درج نہیں کی ہے۔نعیم کوثر کے افسانوی مجموعے''کال کوٹھری''کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ندا فاضلی رقمطراز ہیں:

''آپ کے افسانے،ایک حسّاس دل اور بیدار شعور کے کارنامے ہیں۔ان افسانوں کو تہذیبی جزئیات نے تہہ دار اور تاثر آفرین بنایا ہے۔جو کاغذ پر ختم ہونے کے بعد بھی ذہن میں مسلسل چلتے رہتے ہیں۔اللہ کرے آپ کا قلم یوں ہی تخلیقی طور پر فعال رہے''۔[۲]

نعیم کوثر عصری ادب کے ان ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کے فن میں بے پناہ دلکشی ہے۔نعیم کوثر کے افسانوں میں ایک روایتی معنی خیزیت بھی ہے اور جدید اندازِ بیان بھی ان کی کہانیوں میں بلا خیز بہاؤ ہے۔وہ تہذیب سے روگرداں نہیں ہوتے اور نہ رسوم کی قید میں بندھ کر افسانے کا اسٹرکچر تیار کرتے ہیں۔اس سلسلے میں نعیم کوثؔر کے افسانوی مجموعے''کال کوٹھری''کے سرورق پر ڈاکٹر ذکا الدین شایاںؔ کی رائے درج ہے ملاحظہ کیجئے:

---

۱. مورخہ ۲۱ر جون ۲۰۰۲ء کا مطبوعہ خط۔''لفظ شناس''۔مرتب رشید انجم۔ص ۱۵۳

۲. ''لفظ شناس''۔مرتب رشید انجم۔ص ۱۴۵

''آپ کے افسانے بلا شبہ ایسے افسانے ہیں جن کا مطالعہ آج کے قارئین کو کرنا چاہئے۔ ان کے اندر جدید افسانے کی تمام خصوصیات جھلکتی ہیں۔ زبان، کفایت لفظی، کردار نگار، طبقاتی پس منظر، ڈرامہ ہر جگہ آپ کا قلم با ہوش، رواں اور خوبصورت اسلوب کا حامل ہے۔'' ۲؎

نعیم کوثر کے اکثر افسانے سچّائی پر مبنی ہیں جو سماج میں چاروں طرف بکھری ہوئی ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ زندگی کی سچّی تصویر کشی کرتے ہیں۔ وہ عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی حالات سے مطمئن نہیں ہیں ایک بیچینی اور کرب کی کیفیت ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ وہ اس معاشرے کی دکھتی رگ پر نشتر چلاتے ہیں۔ بحیثیت افسانہ نگار نعیم کوثر ہندوستان میں ہی نہیں پاکستان میں بھی بے حد مقبول اور مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں کو پاکستان کے ادیبوں نے اپنی گراں قدر توصیفی رائے سے نوازا۔ اس سلسلے میں پاکستان کے مشہور مصنف اور ماہنامہ ''قومی زبان'' کراچی کے مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی رائے شامل ہے:

''نعیم کوثر کی کہانیوں یا افسانوں میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی برائیوں اور مسائل کے خلاف بھر پور احتجاج ملتا ہے۔ وہ انسانوں کے حقوق کے لیے لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنے قلم کو انسانی مسائل کے خاتمے کے لئے موثر ہتھیار کے طور سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں۔ یوں اپنی کہانیوں کے توسط سے وہ قارئین کی اکثریت کو اپنے احساسات و جذبات میں شریک کر لیتے ہیں۔ ادیب کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کو ذہنی طور پر متاثر کرے اور ساتھ ہی جمالیاتی

۱؎ سرورق۔کال کوٹھری۔از نعیم کوثر

مسرت فراہم کرے۔ نعیم کوثر کے افسانوں سے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے
ہیں۔ ان کے افسانوں میں طنز کے عنصر کا فنی وفکری استعمال ان میں
مطالعاتی جاذبیت پیدا کرتا ہے۔''[۱]

بھوپال گیس سانحہ ساری دنیا کے لئے انتہائی غم انگیز واقعہ تھا۔ سب تڑپ گئے تھے، سب دہل گئے تھے نعیم کوثر کے حسّاس دل نے اسے ایسے پراثر انداز میں افسانوی روپ دیا کہ ان کی زبان طرزِ بیان کے ساتھ فنی مہارت کا بھی قائل ہونا پڑا۔

نعیم کوثر کے افسانوی مجموعے ''کال کوٹھری'' میں شامل بھوپال گیس سانحہ کی کہانی ''پہلی کہانی'' کی مشہور ادیب وشاعر اقبال نیازی نے ۲۰/ مارچ ۲۰۰۵ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ ایک خط میں تعریف کی اور نعیم کوثر کی افسانہ نگاری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا، ملاحظہ کیجئے:

''کال کوٹھری'' کے افسانے بہت سکون واطمینان سے پڑھ کر اظہارِ
خیال کرنا چاہتا تھا۔ اس میں سے بھوپال گیس سانحہ کی کہانی ''پہلی کمائی''
گذشتہ دنوں ''انقلاب'' میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔ کتاب میں سب سے
پہلے میں نے وہی کہانی پڑھی اور واقعی آپ کی زبان وبیان، بامحاورہ چٹخارہ
دار زبان کا لطف آ گیا۔ آپ کہانی کہنے کا فن بخوبی جانتے ہیں اور خیر یہ تو
آپ کو ورثہ میں ملا ہے لیکن نثر آپ کی ایک الگ پہچان بناتی ہے''۔[۲]

اختر سعید خاں نعیم کوثر کے افسانوں کی اثر انگیزی سے بے حد متاثر تھے۔ وہ ان کی حقیقت نگاری کے متعلق ۲۹/ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے افسانوں کا مجموعہ ''کال کوٹھری''

---

۱ ''خوابوں کے مسیح'' اور دانشوران کی رائے''۔ مطبوعہ ''کال کوٹھری''۔ ص ۱

۲ مورخہ ۲۰/ مارچ ۲۰۰۵ء کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب۔ رشید انجم۔ ص ۱۹۶

اشرف ندیم کی معرفت نظر نواز ہوا۔ چند روز قبل اسی ماہ کے افکار میں تمہارا افسانہ انمول رتن پڑھ کر دیر تک آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ آج بغیر کسی انتخاب کے دو افسانے ''نئی گئو شالہ'' اور ''اللہ کا گھر'' پڑھے۔ دل کا پھر وہی حال ہوا۔ تم نے بچشم نم افسانے لکھے اور میں نے بچشم تر پڑھے۔ افسانہ لکھتے وقت تم اپنی داخلی کیفیت کو افسانے کا جز بنا دیتے ہو اور کیونکہ داخلی کیفیت اصل کیفیت ہوتی ہے اس لیے کہانی واقعہ بن کر سامنے آ جاتی ہے اور پڑھنے والوں کو اس کی صداقت پر کوئی شبہ نہیں رہتا۔ جب ان کو پڑھنے والے کے احساس کی دنیا اشکوں میں ڈھل جائے تو تحسین کے لیے الفاظ کی تلاش ناکام کوشش ہو کر رہ جاتی ہے۔ تم میری چشم تر کا خاموش نذرانہ قبول کرو۔ میں نے ابھی پورے افسانے نہیں پڑھے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ ''کال کوٹھری'' میں طربیہ افسانوں کا اجالا بھی ہوگا۔ کیونکہ زندگی المیہ کے ساتھ طربیہ بھی ہے اور ایک فنکار کے قلم سے ہونٹوں پر تبسّم بن کر کھیلنا بھی جانتی ہے''۔[1]

نعیم کوثر کے افسانوں کے مجموعے ''کال کوٹھری'' میں یوں تو تقریباً تمام ہی افسانے دل پر دیر پا اثر چھوڑنے والے ہیں۔ لیکن ان کا افسانہ ''نئی گئو شالہ'' عصرِ حاضر کے ان سنگین اور دل دکھانے والے حالات کی عکاّسی کرتا ہے جو نوجوانوں کو مادّیت، خودغرضی اور مطلب پرستی سے اس بری طرح جکڑ چکا ہے کہ نوجوان پڑھ لکھ کر اپنا مستقبل بہتر بنانا ہی اپنا مقصد سمجھتے ہیں اور ماں باپ سے بے توجہی اور لا پرواہی کو بے حسی کے ساتھ رواں رکھتے ہیں۔ اس افسانے میں دورِ حاضر میں ضعیف ماں باپ

---

[1] مورخہ ۲۹/ ا کتوبر ۲۰۰۲ء کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۳۱۔ ۳۲

کے ساتھ تعلیم یافتہ لڑکے بڑے ہوکر جو ستم کر رہے ہیں اس کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماں باپ جو اپنے بچّوں کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور اپنے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے میں اپنی زندگی کی تمام پونجی ان پر صرف کر دیتے ہیں لیکن جب وہ بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں تو انکو اپنے بوڑھے ماں باپ بوجھ لگتے ہیں۔ وہ ان کی ماضی کی تمام قربانیوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جس وقت ضعیف ماں باپ کو اپنی اولاد کے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس وقت وہ ان کی خدمت نہیں کرتے اور اپنے ماں باپ کو اپنے ساتھ رکھنا کسی قیمت پر گوارہ نہیں کرتے۔ اس افسانے کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ جو آج گھر گھر کی کہانی بن چکا ہے:

نربھے سنگھ خاندانی راجپوت تھے۔ انکے باپ دادا کی کئی گاؤں میں پھیلی ہوئی زمین اور پرکھوں کی حویلیاں تھیں۔ وہ اپنے بزرگوں کی طرح مزدور اور غریب لوگوں سے محبت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں اور آس پاس کے دوسرے گاؤں کے لوگ نربھے سنگھ کی بے حد عزّت کرتے تھے۔ مویشیوں میں گائے اور بیلوں سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔ انکے لئے انہوں نے ایک گئو شالہ قائم کر رکھی تھی۔ نربھے سنگھ کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اس لئے وہ اپنے اکلوتے بیٹے نرپت سنگھ کو گاؤں کی فضا سے دور دہرہ دون کے ایک انگریزی اسکول میں پڑھنے بھیج دیتے ہیں۔ مغربی کلچر کی چمک دمک اور ماحول کا نرپت سنگھ پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گاؤں کے رسم رواج اور روایتوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور ماں باپ کی عظمت بھی اسکے دل سے نکل جاتی ہے۔ اس منظر کی تصویر کشی نعیم کوثر نے اس طرح کی ہے:

''تجھے کیا ہو گیا میرے لال'' ! ماں کی آنکھوں میں فکر کی بوندیں ابھر آئیں۔

''ماں مجھے گاؤں میں اچھا نہیں لگتا!''

''واہ بیٹا۔ دو سال پہلے تک تیرے پاؤں حویلی میں نہیں ٹکتے تھے۔ صبح سے شام تک آم کے باغ ندی کے کنارے اور مویشی کے باڑے میں اچھل کود کرتا پھرتا تھا۔ آج تیرا من نہیں لگتا۔!'' نربھے سنگھ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''پاپا مجھے اپنا اسکول اور ہوٹل اچھا لگتا ہے۔ مجھے پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔''

''وہ تو اچھی بات ہے بیٹے۔ لیکن یہ ہمارے پرکھوں کی دھرتی ہے آبائی گاؤں ہے۔ یہ سب کچھ تمہیں سنبھالنا ہے۔''

''ممی مجھے یہ سب برا لگتا ہے۔ ہر طرف دھول اور گوبر کی بد بو!''[1]

نرپت سنگھ اسکول سے کالج میں پہنچ جاتا ہے اسی دوران نرپت سنگھ کی ماں نمونیہ کی بیماری میں گزر جاتی ہے اور نرپت سنگھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آل انڈیا سروس کا امتحان پاس کر لیتا ہے اسے مرکزی سیکریٹریٹ میں انڈر سیکریٹری کے عہدے پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ نربھے سنگھ سوچتا ہے کہ یہیں وقت اچھا ہے کی اپنی تمام زمین اور حویلی بیچ کر نرپت سنگھ کے پاس رہنے چلا جاؤں کیوں کہ وہ ہی تو میرے بڑھاپے کا ایک سہارا ہے۔ اس کا ذکر نرپت سنگھ سے کرتا ہے وہ فوراً رضامندی دے دیتا ہے کیوں کہ اسے تو پہلے ہی گاؤں کی زندگی ناپسند تھی۔ نربھے سنگھ اپنی زمین اور حویلی کا سودا اس شرط پر کر لیتا ہے کہ اس کی گئوشالہ کو قائم رکھا جائے۔ نربھے سنگھ کو جائیداد فروخت کرنے سے جو پیسہ ملتا ہے اس کا ڈرافٹ بنواتا ہے اور نرپت سنگھ کی مرحومہ ماں نے جو زیورا پنی بہو کے لئے بنوائے تھے۔ سب لیکر نرپت سنگھ کے پاس

---

[1] کال کوٹھری۔ از نعیم کوثر۔ ص۸۲

جانے کو تیار ہی ہو رہا تھا کہ اسے نر پت سنگھ کا ایک خط ملتا ہے۔ جس میں اس نے لکھا تھا۔ پاپا آپ کی بہو کے بیٹا ہوا ہے۔ یہ سن کر نر بھے سنگھ بہت اداس ہو جاتا ہے کہ بیٹے نے چوری چھپے شادی کر لی اور آگے اس سے خط پڑھا نہیں جاتا۔ اتنے میں نر بھے سنگھ کا منیم آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے زمین اور مویشیوں کو سونپ دیا ہے اور گئو شالہ کی ذمہ داری مجھے مل گئی ہے۔ لیکن آپ اتنے اداس کیوں ہیں تو نر بھے سنگھ وہ خط منیم سے پڑھنے کو کہتا ہے۔ بیٹے کی بے مروّتی اور خود غرضی سے ایک بوڑھے باپ کے ٹوٹے ہوئے دل پر کیا گذرتی ہے افسانے کے اس آخری منظر کو نعیم کوثر نے اس طرح بیان کیا ہے:

''پاپا۔ میں اور کملا آپ کی بہو صبح سے دفتر چلے جاتے ہیں۔ ابھی تو وہ چھٹی پر ہے۔ دہلی میں بنگلوں پر موت برس رہی ہے۔ تنہا رہنے والے چار بوڑھے جوڑوں کا قتل ہو چکا ہے۔ اس لئے ہم نے آپ کے رہنے کا انتظام روٹری کلب کے رین بسیرا میں کر دیا ہے جہاں اسّی کے قریب ریٹائرڈ بزرگ مرد عورتیں بڑے سکھ سے رہ رہے ہیں۔''

ٹھاکر نر بھے سنگھ تیزی سے منیم جی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گئو شالہ کی طرف بڑھے۔

''دیکھا منیم جی۔۔۔۔۔۔۔ہم۔۔۔۔۔۔ہم جن کے پرکھے ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں شہید ہوئے وہ آج رین بسیرا میں رہیں۔۔۔۔۔۔ یہ ہے ہمارے اکلوتے ویر نر پت سنگھ کی گئو شالہ۔۔۔ نئے زمانے کے مجبور بزرگ ماں باپ کی آخری آرام گاہ۔ لعنت ہے منیم جی لعنت۔۔۔۔''[1]

یہ ایک ایسا کڑوہ سچ ہے جس کا زہر ہمارے سماج میں ہر طرف پھیل رہا ہے۔

دسمبر ۲۰۰۶ء میں نعیم کوثر کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''اقرار نامہ'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

---

[1] کال کوٹھری۔از نعیم کوثر۔ص ۸۵

دہلی نے شائع کیا۔ ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں کل ۱۱۴ افسانے ہیں۔ ''ٹھکانا''، ''نیا مندر''، ''آخری خواہش''، ''علَم داد''، ''ایک دن کا سلطان''، ''اللہ ایک ہے''، ''رب کا شکر ادا کر بھائی''، ''کچھوا چال''، ''نامحرم''، ''سرکٹی پر چھائیں''، ''چٹّھی رساں''، ''پگھلتی برف''، ''نئی اذان'' اور ''اقرار نامہ''۔ یہ وہ افسانے ہیں جو نعیم کوثر نے ''خوابوں کے مسیحا'' اور ''کال کوٹھری'' کی اشاعت کے بعد لکھے اور مختلف رسائل میں شائع ہوئے اورانہوں نے ادبی نشستوں میں پڑھے۔اس افسانوی مجموعے کا انتساب نعیم کوثر نے اردو کے مشہور ادیب اور ناقد رشید احسن خاں کے نام ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میں اپنے اس افسانوی مجموعہ کو زبان وادب کے جری قلب مرد میداں، تحقیق کے فرہاد صفت کوہکن اور تنقید کے قیس مثال صحرا گرد جناب رشید حسن خان (خلد آشیانی) کے نام گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔ وہ میرے افسانوں کو دلجوئی سے پڑھتے تھے اور ناچیز سے گہرا خلوص اور محبت کرتے تھے''۔[۱]

نعیم کوثر کے افسانوں کے مجموعے ''اقرار نامہ'' کا ''پیش لفظ'' رشید حسن خاں کا لکھا ہوا ہے۔اور مظفر حنفی کا ایک مضمون ''حرفِ آغاز'' کے نام سے شامل ہے جس میں وہ نعیم کوثر کی تحریروں سے ناقدین کا بے اعتنائی کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نعیم کوثر بھی ان تنقید گزیدہ تخلیق کاروں میں شامل ہیں جن سے ہمارے ناقدین ادب نے مسلسل بے اعتنائی برتی ہے۔نقاد اگر لکھنے والوں کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے ممتاز تخلیق کار تسلیم نہ کرے تو

---

۱ اقرارنامہ۔کاانتساب۔ ازنعیم کوثر

بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذاتی پسند اور ناپسندگی کے اظہار کا حق ہے لیکن مسلسل چالیس برسوں سے تخلیقی کام کرنے والے کسی فرد کو پیہم نظر انداز کرتے رہنا اور اسکے بارے میں مجرمانہ خاموشی اختیار کرنا انتہائی قابلِ اعتراض عمل ہے اور نعیم کوثر کے سلسلے میں اس غفلت اور دانستہ کردار کشی کا ازالہ جلد ہونا چاہیئے۔''[۱]

اسی مضمون میں مظفر حنفی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''خوابوں کے مسیحا'' سے ''کال کوٹھری'' تک کا ادبی سفر انہوں نے مستانہ وار طے کیا ہے اور ایک اچھے اور سچّے افسانہ نگار کی مانند کوئی پرواہ نہیں کہ زمانہ انہیں داد دے رہا ہے یا نہیں۔ اب تو وہ ایک نئے افسانوں کے مجموعے کی آمد کی خبر دے رہے ہیں۔ وحدتِ تاثر اور پلاٹ و کردار کے حامل ایسے افسانے، جنہیں علامت پسند نقاد خاطر میں نہیں لاتے، آج بھی قارئین کی اکثریت کے لیے پسندیدہ ہیں۔ حسب حال چٹخارے دار، چست و درست مکالمے، کشش و پیچ اور کلائمکس سے لبریز پلاٹ، دلچسپ اور انوکھے کرداروں سے مزین واقعات، روزمرہ اور ضرب المثل سے آراستہ اور کہاوتوں سے پیراستہ زبان کا مزا لینا ہو تو کوئی نعیم کوثر کے افسانے پڑھے جس نے خواہ بہت اچھا نہ لکھا ہو لیکن سب سے الگ لکھا ہے۔''[۲]

''اقرار نامہ'' کے افسانے بھی ایسے ہی ہیں کہ ان کو پڑھ کر اگر ہونٹوں پر مسکراہٹ آئے گی

---

۱ حرفِ آغاز۔ مطبوعہ۔ اقرار نامہ۔ از نعیم کوثر۔ ص ۱۰

۲ حرفِ آغاز۔ اقرار نامہ۔ از نعیم کوثر۔ ص ۱۰

تو اس کے ساتھ آنکھیں بھی بھیگ جائیں گی ۔

نعیم کوثر کے پاس خوبصورت الفاظ کا زبردست ذخیرہ ہے ان کے افسانوں میں خیال آفرینی اور رنگینی بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی خوب کرتے ہیں ۔ ان کے اکثر افسانے بیانیہ ہوتے ہیں ۔ کچھ افسانوں سے قطع نظر کی جائے تو عموماً ان کے افسانوں کا پلاٹ کسی پیچیدگی کا شکار نہیں ہوتا ۔ انکی عبارت میں روانی، ربط اور تسلسل ہوتا ہے ۔

طالب شملوی ۱۸ / جنوری ۲۰۰۷ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ خط میں نعیم کوثر کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''آپ کے افسانوں کا مجموعہ پہلے ''کال کوٹھری'' پڑھا اس میں کئی افسانے تھے جنہوں نے دل و دماغ دونوں پر اپنا تاثر چھوڑا اور اب ''اقرار نامہ'' کے افسانے پڑھے ۔ اس میں ۱۴ افسانے ہیں جن میں چند میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں مگر اب دوبارہ بھی اسی دلچسپی سے پڑھے جتنی کہ پہلی بار ۔
>
> یقین جانیئے مدّت کے بعد افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جسے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا ۔ ہر افسانے نے متاثر کیا اور ایک کے بعد دوسرے افسانے کو پڑھنے پر مجبور کیا ۔ آپ کے ہاں ہر وہ بات ہے جو افسانہ کو افسانہ بنا دیتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ افسانہ پورا پڑھا جائے ۔ ان میں افسانوں کا متن موجود ہے ۔ مواد بھی اور اسلوب تحریر و بیان بھی اچھا ہے ۔ حقیقت اور تخیل کا حسین امتزاج ہے ۔ کئے بار افسانوں کے اختتام نے چونکا دیا ۔ نازک ذہنی احساسات کو تحریک ملتی ہے ۔ حقیقت بھی

ہے اور جدّت بھی ہے۔ سچ بات ہے اندازِ بیان پڑھنے والے کو باندھے رکھتا ہے۔ افسانوں کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھے ادب کے پڑھنے والے اسے پسند کریں گے اور بھرپور پذیرائی کریں گے۔ آپ اس مجموعے کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔''[۱]

عابد سہیل نعیم کوثر کو تحریر کردہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اقرار نامہ'' مل گیا تھا۔ سوچا تھا کہ ساری کہانیاں پڑھ کر آپ کو خط لکھوں گا لیکن ایک سال دو سال پرانی بیماری کا یکا یک علم ہوا اور کام کی رفتار سست ہو گئی چنانچہ اب تک ''ایک دن کا سلطان'' تک پہنچ سکا ہوں۔

یہ سارے افسانے ہی اچھے ہیں۔ خاص طور سے ''ٹھکانہ'' اور آخرالذکر۔''[۲]

ذہنِ جدید کے ایڈیٹر زبیر رضوی (مرحوم) اپنے خط میں نعیم کوثر کے افسانے ''اقرار نامہ'' کی بے جا طوالت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے بعد بارہ لائن آپ نے ''وضاحتی انداز'' میں افسانے میں جوڑی ہیں میرے خیال میں اس نے کہانی کے تاثر کو گول پوسٹ سے ٹکرا کر میدان میں واپس آنے والی فٹبال طرح زائل کر دیا۔ کہانی کا تقاضہ تھا کہ آپ یہ نہ بتاتے کہ تیواری نئی دوکان میں جا کے جم گیا اور اس نے مسلم آبادی کا محلّہ چھوڑ دیا۔

افسانہ ہمیشہ اپنے سچ کو اس موڑ پر لا کے چھوڑتا ہے جہاں سے

۱۔ مورخہ ۱۸؍جنوری ۲۰۰۷ء کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۱۹۵۔۱۹۶

۲۔ مورخہ ۱۱؍جنوری ۲۰۰۷ء۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۷۸

قاری سچ کی مزید راہیں کھولنے کا عمل اپنانے لگتا ہے۔ قاری کو قیاس کرنے دیجئے کہ تیواری اسی محلے میں اسی دوکان میں رہا یا اس نے نئی دوکان میں جا کر نئے گاہکوں کو پان لگا کے کھلانا شروع کر دیا۔ کہانی میں مہتہ کی واپسی یا دو بارہ داخلے کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ مہتہ کے کردار کی آبیاری کی کیا ضرورت تھی؟ کہانی تیواری کے جس متوقع بلکہ نسبتاً غیر متوقع ردعمل (اسٹامپ پیپر کے پرزے پرزے کر کے اسے ہوا میں اچھال دینے) پر ختم ہوتی ہے وہ قاری کو یہی طمانیت دیتی ہے کہ تیواری نے محلّہ نہیں چھوڑا ہوگا اور اس نے سلیمان کی بیوہ کے لئے کوئی اچھا سلوک روا رکھا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ کہانی کا آخری سرا قاری کو تھما کر افسانہ نگار کو اوجھل ہو جانا چاہئے میرے خیال میں کہانی اگر مذکورہ پیراگراف پر ختم ہو جائے تو کہانی اگر بڑی نہ کہی جا سکے تب ہی یہ آپ کی اور اچھی کہانی ضرور کہی جائے گی۔''[1]

نعیم کوثر کے افسانوں کے مجموعے ''اقرار نامہ'' کے افسانے ان کی فنی مہارت اور سماجی اقدار کی سچائی کے اظہار کے ساتھ جیتے جاگتے کرداروں کے شمولیت کے باعث ناقدین اور قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر پریمی رومانی ۲۵/ مارچ ۲۰۰۷ء کو نعیم کوثر کو لکھے گئے ایک خط میں نعیم کوثر کے افسانوں میں موجود کردار نگاری اور دلچسپی کے عنصر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کا گراں قدر افسانوی مجموعہ ''اقرار نامہ'' موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ۔

---

[1] مورخہ ۸/جنوری ۲۰۰۷ء کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۱۲۷۔۱۲۸

میں ان افسانوں کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہا ہوں یہ افسانے مجھے اپنی
سادگی اور متانت کے لیے پسند ہیں۔ ہر ایک افسانہ شروع سے آخر تک
دلچسپی کا عنصر قایم رکھتا ہے۔ان میں تسلسل اور اعتدال پایا جاتا ہے۔
کردار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ابھرتے ہیں اور اپنا فرض نبھا
کر کہانی میں جان پیدا کرتے ہیں۔اور یہی کیا کچھ کم اہم ہے۔''[۱]

نعیم کوثر کی کہانیوں کی اہم خصوصیت ان کا منفرد اندازِ بیان ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی کہانیوں کو پڑھ کر ان کے مشاہدے اور تجربے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر صغریٰ مہدی ۳۱ رجنوری ۲۰۰۷ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ اپنے خط میں تحریر کرتی ہیں:

''آپ کی کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو جھنجھوڑتی ہے اور اس
کا تاثر دیر تک رہتا ہے۔اس لیے پہلی ہی کہانی نے اس قدر متاثر کیا کہ
دوسری کہانی کو پڑھنے کی نوبت دو دن بعد آئی۔آپ کی بعض کہانیاں اپنے
موضوع انداز اور ایک حد تک زبان کی وجہ سے پریم چند کا انداز لگتا ہے مگر
اس میں اپنی انفرادیت بھی ہے۔جیسے ''نیا مندر''[۲]

نعیم کوثر کے افسانوں کو نہ صرف سمجھدار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ قاری ہی پسند کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور فکشن نگاروں سے بھی سچی تعریف وصول کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔موجودہ دور کے نامور فکشن نگار انجم عثمانی (مرحوم) انکے افسانوی مجموعہ ''اقرارنامہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے نعیم کوثر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

---

[۱] مورخہ۔۲۵ رمارچ ۲۰۰۷ کا مطبوعہ خط۔لفظ شناس۔مرتب: رشید انجم۔ص ۲۴۰

[۲] مورخہ۔۳۱ رجنوری ۲۰۰۷ء۔کا مطبوعہ خط ''لفظ شناس''۔مرتب: رشید انجم ص ۲۴۸

''بہت دن بعد ایک ساتھ اچھی کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ خاص طور سے وہ کہانی جو کسی ایک کردار کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ بہت متاثر کرتی ہیں۔ کردار نگاری واقعتاً لا جواب ہے۔ خاص طور پر ٹائٹل کہانی ''اقرار نامہ'' ایک شاہکار کہانی ہے اور دیر تک ذہن پر چھائے رہتی ہے۔

مجھے ایک کہانی کار کے طور پر بھی آپ کی کہانیوں پر رشک آیا، خاص طور پر آپ کی کہانیوں کا بیانیہ بہت مضبوط ہے اور ماجرے کو آپ نے جس طرح بیانیہ سے منسلک کیا ہے اس نے کہانی میں مزید لطف پیدا کر دیا ہے۔ میرے خیال میں ماجرے کے بغیر کہانی کا وجود ممکن نہیں ہے۔ پھر سے اصطلاحاً آپ جس چیز کو چاہیں کہانی کہہ لیں۔

''علم داد'' میں کہانی کی جس تکنیک کا آپ نے استعمال کیا ہے اس میں بیانیہ کے جھول کے بہت سے موقع تھے مگر آپ کے تجربے اور فکشن کے تئیں آپ کے خلوص نے اسے غیر معمولی کہانی بنا دیا ہے۔ آپ ایسی کہانیوں کی تخلیق سے بہرہ مند ہیں جن (جو) مصنف سماجی سروکار کے ساتھ مخلص اور کرداروں کے ساتھ ایماندارانہ ہوتا ہے۔ کہانی میں بھی غالب یہی وجہ ہے۔ مبارکباد۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اتنی اچھی کہانیاں پڑھنے کا موقع دیا۔''[۱]

نعیم کوثر کے افسانوی مجموعہ ''اقرار نامہ'' کے افسانے عام انسانوں کی زندگی اور مسائل کے بیان پر مبنی ہیں۔ ایسا ہی ایک افسانہ ''ٹھکانا'' بھی ہے۔ اس افسانے میں نعیم کوثر نے سماج کے سب سے

---

[۱] لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۲۶۱

زیادہ دبے کچلے اور معاشی اعتبار سے بہت بدحال اور بہت ہی بےعمل طبقے کا ذکر کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بھکاری تو دوسروں پر منحصر رہ کر بغیر محنت کئے اور بنا تکالیف اٹھائے پیٹ بھر روٹی تن بھر کپڑا اور کبھی اس سے بھی زیادہ حاصل کر لیتے ہیں لیکن نعیم کوثر نے ان کی زندگی کو بھی بہت نزدیک سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا ہے اس کہانی میں ان کے مسائل کو نعیم کوثر نے بڑی گہری نگاہ سے محسوس کر کے تحریر کیا ہے۔

اس کہانی کا اہم کردار شاہ جی ہیں جو شہر کی بڑی مسجد کے مشرقی دروازہ کی پہلی کی سیڑھی پر اس لئے اپنا ٹھکانا بتاتے ہیں کہ یہاں انھیں بہت آسانی سے بہت ساری بھیک مل جاتی ہے۔ انکی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام اختری تھا۔ اختری بہت خوبصورت، صحتمند اور خوش اخلاق تھی ہر وقت شاہ جی کو اپنی بیٹی کی شادی کی فکر رہتی ہے۔ ایک دن اختری شاہ جی سے مدرسے میں پڑھنے کی ضد کرتی ہے اور شاہ جی کو منانے کے لئے طرح طرح سے منّت وسماجت کرتی ہے لیکن شاہ جی اختری سے صاف انکار کر دیتے ہیں یہاں نعیم کوثر نے باپ بیٹی کے اس منظر کی تصویر بڑے ہی خوبصورت انداز میں کھینچی ہے انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

''بابا'' ایک رات اختری نے شاہ جی کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔

''بول بیٹی''!

مجھے مدرسے میں پڑھنے کو بول دو۔ سامنے سڑک پار

ڈھیر سارے بچے بچیاں پڑھتی ہیں۔ ان کی آوازیں میرے

دل کو کھینچتی ہیں بابا۔!

''دیوانی تو نہیں ہوگئی؟ شاہ جی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے روٹی ہاتھ

سے رکھ دی'' بھیک مانگنے والے بھی کہیں پڑھا کرتے ہیں۔؟

''میں کب بھیگ مانگتی ہوں؟''

''نہ مانگے۔ ہے تو بھکاری کی بیٹی۔ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلی بڑھی ہے!''

''تو کیا ہوا؟ مجید چچا کی لڑکیاں بھی تو وہاں پڑھنے جاتی ہیں!

مجھے بھی جانے دو نا بابا!''

اختری نے گھگھیا کر کہا تو شاہ جی نے بری طرح جھڑک دیا۔

''کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اپن کو اوقات نہیں بھولنی چاہئے۔ جھونپڑی میں رہ کر اونچی باتیں! کان کھول کر سن۔ چیتھڑوں میں پیدا ہوئے اور انہیں میں دفن ہونا ہے۔ جا سو جا!''[1]

شاہ جی وہاں کے سماج، معاشرے اور اردگرد کے ماحول سے اچھی طرح واقف ہیں کہ یہاں پر لوگ بہت جلدی کچھ بھی کر گذرتے ہیں۔ ان کا اپنی بیٹی کو عزّت کے ساتھ وداع کرنے کا خواب تھا۔ دوسرے دن شاہ جی گھر کو لوٹ رہے ہوتے ہیں تو راستے میں راجہ نام کا بدمعاش جس کے ایک ہاتھ اور ایک آنکھ نہیں تھی۔ شاہ جی کو روک لیتا ہے اور اختری کا ہاتھ ان سے مانگنے لگتا ہے شاہ جی بری طرح سے غصّہ کرتے ہیں اور راجہ سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اتنے میں شاہ جی کے دوست مجید چچا اور وہاں کھڑے لوگ آ جاتے ہیں۔ مجید چچا شاہ جی کو تسلّی دیتے ہیں اور کہتے ہیں پروردگار تمہیں نیک داماد ضرور بھیجے گا۔ راجہ کے اس رویہ کی وجہ سے شاہ جی رات بھر سو نہیں پاتے اور اپنی بیٹی کی شادی کی فکر میں بے چین رہتے ہیں صبح کی تاریکی میں وہ باہر سڑک پر آ جاتے ہیں انکی نظر ادھر سے آتے ہوئے ایک نوجوان پر پڑتی ہے۔ جس کے گھٹنوں کے نیچے ایک پیر نہیں تھا شاہ جی کو وہ نوجوان نیک اور شریف نظر آتا ہے جب شاہ جی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں تو وہ شاہ جی سے کہتا ہے کہ میں فتح پوری سے آیا ہوں اور میرا نام شبّن ہے۔ فتح پوری میں بھیک مانگنے والے

---

[1] اقرارنامہ۔ از نعیم کوثر۔ ص ۱۲

فقیروں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے وہاں پر گزارا بڑی مشکل سے ہو پاتا ہے میں یہاں نئے ٹھکانے کی تلاش میں آیا ہوا سی درمیان فجر کی اذان ہو جاتی ہے اور دونوں مسجد کی طرف چل دیتے ہیں شاہ جی اسے مسجد کے شمالی دروازے کی پہلی سیڑھی کو اپنا ٹھکانا بتاتے ہیں۔شبّن کہتا ہے کہ واقعی جگہ تو بڑے موقعے کی ہے۔ باتوں ہی باتوں میں شاہ جی شبّن سے اختری کی شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں شادی کرنے کے لئے وہ شاہ جی سے انکا ٹھکانا مانگتا ہے۔شاہ جی بیٹی کی خوشی کی خاطر اپنا ٹھکانا یعنی مسجد کی سیڑھی جہاں انہیں خوب بھیک ملتی تھی شبّن کو دے دیتے ہیں۔ وہ وہاں پر چادر پھیلا کر بیٹھتا ہی ہے اور اسکی چادر پر سکّے گرنے لگتے ہیں۔ اتنے میں مجید چچا دوڑے ہوئے آتے ہیں اور شاہ جی کو اپنے پاس بلا کر کہتے ہیں کہ میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں نیک داماد ملیگا وہی ہوا۔اختری مدرسے کے ماسٹر جی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔شاہ جی سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ نہ تو بیٹی کی شادی شبّن سے ہو پاتی ہے اور انکا ٹھکانا بھی چھن جاتا ہے۔

''اگنی پریکشا'' نعیم کوثر کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔۱۶۰ صفحات کے اس مجموعے کا انتساب نعیم کوثر نے اپنے ہم عصر فکشن نگار عابد سہیل کے نام ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میں اپنے اس افسانوی مجموعے کو عصرِ جدید کے ممتاز افسانہ نگار اور صحافی جناب عابد سہیل کے نام معنون کرتا ہوں جن کے افسانے زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی جستجو میں رہتے ہیں اور جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد سے آج تک انہیں نظریات پر ثابت قدم ہیں''[1]

اس مجموعے میں افسانوں کی تعداد ۱۵ ہے جن میں سے چند اہم کے نام ''نورنگی''، ''بلّی

---

[1] اگنی پریکشا۔انتساب۔ازنعیم کوثر

کی گھنٹی''، ''بجو کا شکر گنجی''، ''چوزہ''، ''دو بوند زندگی کی''، ''نروان''، ''جرمن شیفرڈ''، ''نئے ویرانے''، ''اگنی پریکشا''، ''کتبے کی فریاد'' اور ''پاک دامنی'' وغیرہ۔

''اگنی پریکشا'' کے یوں تو سبھی افسانے قاری کو صفحہ اوّل تا آخر باندھے رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ لیکن ''نورنگی''، ''بلّی کی گھنٹی''، ''اگنی پریکشا''، ''چوزہ''، ''جرمن شیفرڈ''، ''مٹھو چتر کوٹی'' اور پاک دامنی'' سیدھے دل پر اثر اندوز ہوتے ہیں۔ ایک سوچ ایک فکر قاری کو بے بس کر جاتی ہے۔ وہ یہ طے نہیں کر پاتا کہ وہ ان افسانوں کی کس طرح داد دے؟ اگر داد دے بھی تو ہونٹ ساکت رہتے ہیں اور آنکھوں میں نمی آجاتی ہے۔ یہ افسانے جھنجھوڑتے ہیں۔۔غرض یہ افسانے نعیم کوثر کو عصری افسانے کی نئی فرہنگ دینے کا باعث ہیں۔ کہ ان میں ان کا مشاہدہ نمایاں ہوا ہے جو صرف ایک ایمان پرور تخلیق کر کا ہی وصف ہوسکتا ہے۔

نعیم کوثر کے افسانوی مجموعہ ''اگنی پریکشا'' کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شارب ردولوی ۱۲/دسمبر ۲۰۰۹ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کو بیانیہ پر جو گرفت ہے وہ اچھی لگی۔ آپ کی کہانیاں زندگی سے اتنی قریب محسوس ہوئیں کہ سچ کا گمان ہوتا ہے۔ آپ کی کہانیوں میں ایک اور بات نے متاثر کیا وہ آپ کی زبان کہوں یا آپ کی کہانیوں کی زبان ہے جو دل پر اثر کرتی ہے۔''[1]

نعیم کوثر کا یہ مجموعہ ان کے ارتقائی سفر کے غمّاز ہے ان کے اسلوب کا جونکھار جذبے کے اظہار پر ان کی مکمل قدرت اور کرداروں کی بہترین تشکیل کو واضح کرتے ہیں۔ نعیم کوثر کے افسانوی مجموعہ ''اگنی پریشا'' پر حسرت فرخ آبادی ایک خط میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] مورخہ ۱۲/دسمبر ۲۰۰۹ء۔ کا مطبوعہ خط۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۲۵۶

> ''اگنی پریکشا'' کے سارے افسانے اور افسانوں کے کردار ہماری اپنی دیش کی مٹی سے جڑے ہیں۔ ساری کہانیاں ہماری مشترکہ تہذیب کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی وسکھ ہمارے دیش میں ساتھ ساتھ مل کر رہتے آئے ہیں۔ اور مذاہب جو ہم کو آپس میں مل جل کر رہنے کی تلقین کرتے ہیں اُس سے ایک ایسی مشترکہ تہذیب پیدا ہوئی ہے جس میں ہم نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ آپ کے سارے افسانے اُسی تہذیب کے آئینہ دار ہیں اور جو اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔''[۱]

نعیم کوثر اپنے اکثر افسانوں میں طوالت سے گریز کرتے ہیں اور اختصار کے پابند ہیں کم سے کم الفاظ میں افسانے کا آغاز کرتے ہوئے اسے اختتامیہ تک لے جاتے ہیں۔ محاوراتی زبان کا استعمال وہ اپنے افسانوں میں کثرت سے کرتے ہیں۔ وہ محض تخّیلاتی اور تصوّراتی پلاٹ پر اپنی کہانیوں کی بنیاد کھڑی نہیں کرتے زندہ حقیقتیں ان کی کہانیوں میں بولتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں حیات کی بقا بھی سچ کی مانند نظر آتی ہے۔ انجم عثمانی نے ۷/دسمبر ۲۰۰۸ء کے خط میں نعیم کوثر کے افسانہ ''نروان'' کی تعریف ان الفاظ میں کی ملاحظہ کیجئے:

> ''آپ کی تحریر کہانی ''نروان'' پڑھی۔ بے اختیار دل چاہا کہ اس کی فوری داد دی جائے۔ کہانی واقعی داد کے لائق ہے۔ خاص طور پر کہانی کا اختتام۔ کتنے سادہ اور آسان طریقے سے آپ نے اتنی گہری بات کو بیان کردیا ہے۔ نثر میں سہل ممتنع کا مزہ آ گیا۔
>
> اگر کبھی اردو کے بہترین کردار کہانیوں کا انتخاب ہو تو یہ کہانی خلیفہ خاں کے کردار کے بغیر مکمل نہیں کہلائے گا۔

---

[۱] مورخہ۔ ۲۰/ اگست ۲۰۰۹ء کا خط مطبوعہ۔ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۲۶۳

اس قبیل کی کہانیاں اور آپ جیسے سچّے۔ اچھے کہانی کاروں کے طفیل ہی نامساعد حالات میں بھی کہانی کی مقبولیت باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اردو کہانی کو چیستاں بننے سے محفوظ رکھے۔

''نروان'' صفحات پر جتنی کم پھیلی ہوئی ہے کینوس کے اعتبار سے اس سے بھی کہیں زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ مثل پرانی ہے مگر سمندر کو کوزے میں اسی طرح بند کیا جاتا ہے۔

مجھے آپ کی کہانی پڑھ کر رشک آیا۔ اللہ ہم کو بھی سچی اچھی کہانی لکھنے کی توفیق دے۔''[۱]

نعیم کوثر کے ہم عصر ناقد اور مصنف ان کی افسانہ نگاری پر بے ساختہ تبصرہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ محمد ایوب واقف نے ''اگنی پریکشا'' کے افسانوں کا اس انداز میں تنقیدی جائزہ لیا ہے:

''سچائی یہ ہے کہ آپ بڑے باپ (کوثر صاحب) کے بڑے بیٹے ہیں۔ میں آپ کو بڑا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ کے ادبی خزانے میں ''خوابوں کا مسیحا''، ''کال کوٹھری'' اور ''اقرار نامہ'' جیسے گراں قدر افسانوی مجموعے ہیں اور اب ''اگنی پریکشا'' جیسا بے پناہ اہمیتوں کا حامل مجموعہ اس میں شامل کر لیجیے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ معیار اور مقدار کے اعتبار سے ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی اور خواجہ عباس وغیرہ بہت آ گے ہیں اور ان کے جیسے لوگ اب میدانِ افسانہ نگاری میں سامنے نہیں آئیں گے۔ لیکن حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ آپ ان سے

---

[۱] مورخہ ۷/دسمبر ۲۰۰۸ء۔ کا مطبوعہ خط لفظ شناش۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۲۵۹

بھی آگے نکل گئے ،شہرت کی بات الگ ہے کیونکہ یہ تو عطیہ خداوندی ہے جو سب کو یکساں طور پر نہیں ملتی ،کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ آپ کا تخلیقی سفر آپ کے چھ سو پچاس (۶۵۰) افسانوں کا رہین منت ہے اور حالت یہ ہے کہ خود کو کسی شمار و قطار میں شامل نہیں کرتے ۔''اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا'' نئی کتاب ''اگنی پریکشا'' کا ابھی تک ایک ہی افسانہ پڑھ سکا۔ اس افسانے کو پڑھنے کے بعد صدیوں پرانے اس مفروضے کو تازگی اور نادرہ کاری حاصل ہوتی ہے کہ کس لیے شکوک وشبہات حقائق پر دبیز پردہ ڈال دیتے ہیں اور انسان سچائی تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے نیز یہ بھی کہ چھوٹے اور بڑے کی تمیز نے انسان کو خامیوں کی اماجگاہ بنائے رکھا ہے۔''[۱]

نعیم کوثر اپنے افسانوں کے ذریعہ سماج کو اس کا اصلی چہرہ دیکھاتے ہیں۔ تعلیمِ نسواں کی ضرورت، سرمایہ داروں کے ذریعہ غریبوں کا استحصال، بے روزگاری ،قومی یکجہتی ،موجودہ دور میں ہو رہے فسادات، سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں، گمراہیوں کے علاوہ گردو پیش ہونے والے مختلف حادثات مظلوم و بے بس عورتوں کا استحصال، پٹھانوں کی سخت گیری، علاقائی کشمکش ،کسانوں کی زبوں حالی، جاگیرداروں کے ذریعہ مسلسل کسانوں پر کیا جارہا جبر اور تشدّد ،فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن سے نعیم کوثر کا قلم آتشِ فشاں کی طرح لاوا اگلتا ہے۔اس کے علاوہ قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد، حب الوطنی رومانی موضوعات، مذہب کے نام پر کیا جارہا لوگوں کا استحصال، بھوپال گیس ٹریجڈی کے شکار لوگوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

نذیر فتح پوری نعیم کوثر کو تحریر کردہ ایک خط میں نعیم کوثر کے افسانہ ''چمڑے کا سکّہ'' پر تبصرہ کرتے

---

۱ مورخہ۔۶ ؍ستمبر۲۰۰۹ء۔کا مطبوعہ خط۔لفظ شناس۔مرتب رشید انجم۔ص ۲۵۸

ہوئے رقمطراز ہیں:

''آپ نے بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ آج سارے بھشتی محلے میں کوئی نہ کوئی جبّار پیدا ہوگیا ہے، سب پختہ گھروں میں رہتے ہیں۔ عیش و آرام کی زندگی جیتے ہیں۔ تعلیم کی روشنی بھی ان کے گھروں کو منور کررہی ہے۔ اب کالے کلوٹے اور بد ہیئت بچّے ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتے۔ اب ان کے گھروں میں ڈاکٹر اور ٹیچر بھی پیدا ہونے لگے ہیں۔ آپ کا افسانہ حقائق کا ترجمان ہے۔ جبار کا کردار روشنی کا استعارہ ہے۔ میں نے اس موضوع پر پہلے کوئی افسانہ نہیں پڑھا۔ ہمارے یہاں چھوٹی برادریوں میں ہی بڑے افسانے ملتے ہیں۔ بس تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے تلاش کیا تو موتی پالیا۔ اس افسانے میں قومی یکجہتی پر بھی الگ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ نفرت کو مٹانے کے لیے محبتیں بانٹنا بہت ضروری ہے۔ پنڈت ایشور پرشاد جیسے لوگ اکیلے رہ جائیں گے اور دنیا محبت کی ریل میں بیٹھ کر آگے نکل جائے گی جہاں اگلے اسٹیشن پر کوئی سقّا اپنی محبت کی مشک سے آب حیات پلانے کے لیے مسافروں کے انتظار میں کھڑا ہوگا۔''[۱]

نعیم کوثر اپنے افسانوں کے ذریعہ سماج کی سچّی تصویر کشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ جیسے پرانے دور میں پھیلی ہوئی گمراہیوں، روڑیوں اور سماج میں چلے آرہے غلط رسم و رواج پر بھی نشتر چلاتے ہیں۔ اسی طرح کے

۱؎ مورخہ ۲۳؍اگست ۲۰۰۹ء کا مطبوعہ خط لفظ شناس۔ رشید انجم۔ ص ۲۱۳۔۲۱۴

موضوعات پر مشتمل ان کا افسانہ ''بلّی کی گھنٹی'' ہے جو ایک طرف تو سماج میں پل رہے غلط رسم و رواج اور بدشگنی کو ماننے والوں کی تنگ نظری کو پیش کرتا ہے۔ تو دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کی تصویر بھی ہے۔ جو ضعیف الاعتقادی اور عورت پر مرد کا بے جا ظلم اور حق طلفی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس افسانے کا خلاصہ درج ذیل ہے:

کبیر بلّی سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ جب اس کا باپ گھر سے نکلا تو ایک دن بلّی راستہ کاٹ گئی اور وہ اسی دن ایکسیڈ ینٹ میں مر گیا۔ کبیر کی بیوی مجیدن کے بچے نہیں تھے۔ وہ اپنا دل بہلانے کے لیے بلی پالنا چاہتی تھی۔ اس کا ذکر مجیدن نے کبیر سے کئی بار کیا۔ کبیر جواب میں مجیدن کو برا بھلا کہتا ہے اور بلی کو منحوس جانور مانتا ہے۔ لیکن مجیدن بلّی کے لیے تڑپ رہی تھی وہ پڑوس میں رہنے والی نارائن کی موسی کے ذریعہ کبیر کے پیر صاحب سے سفارش کرواتی ہے۔ اور یہ سمجھ کر کبیر پیر جی کے بہت معتقد ہیں۔ ان کے حکم سے بلی پالنے کو تیار ہو جائیں گے اور بلی لے آتی ہے۔ جب کبیر گھر آ کر مجیدن کے پاس بلی کا بچہ دیکھتا ہے تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ جنّاتوں والے پیر صاحب کی بات بھی نہیں مانتا جن کا وہ مرید تھا۔

یہاں نعیم کوثر نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کا روشن رُخ اس طرح پیش کیا ہے کہ مجیدن کہتی ہے کہ بلی پالنے سے چوہوں سے حفاظت رہے گی۔ گھر میں چوہوں نے جینا دشوار کر رکھا ہے۔ میرے شادی کے جوڑے بھی کاٹ ڈالے تو کبیر نے جواب دیا ملاحظہ کیجئے:

> ''اللہ کی بندی۔ تجھے کپڑوں کی فکر ہے۔ نارائن کی بہنوں کی بنارسی
> ساڑھیوں اور شادی کے جوڑوں کا نہیں سوچا۔ ساٹھ سال پرانا پڑوسی ہے
> نارائن کا پریوار بلی لے آئی۔ اب چوہے بھاگ کے اس کے گھر میں
> جا بسیں گے۔''! پھر کبیر خاں نے عقاب جیسے باز وکھولے اور بلّی کے بچے کو

اٹھا کر پوری طاقت سے زمین پر دے مارا۔ مجیدن کی تنہائی پر پر ہول سناٹا
چھا گیا۔'' [۱]

زبیر رضوی ایڈیٹر ''ذہن جدید'' ۲۷/اکتوبر ۲۰۰۸ء کو نعیم کوثر کو تحریر کردہ ایک خط میں نعیم کوثر کے افسانہ ''بلی کی گھنٹی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''کہانی بامعنی انداز میں ختم ہوئی ہے۔ پڑوس اور دوسروں کے دکھ درد کو اپنا لینے کا احساس آپ کے یہاں خاصا ہے۔ کہانی کی زیریں لہر یہ بھی ہے کہ یگانگت کا وہ احساس اپنے فطری انداز میں معاشرے کے کمزور طبقے میں کہیں زیادہ توانا ہے جو دوسروں میں کم ہوتا جا رہا ہے۔'' [۲]

نعیم کوثر کے افسانوں کا پانچواں افسانوی مجموعہ ''آخری رات'' کے نام سے اسٹار، آفسیٹ، ایم۔ پی۔ نگر بھوپال سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ جس میں ۱۷/افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے کا انتساب نعیم کوثر نے مشہور صحافی اور فکشن نگار حضرات نند کشور وکرم اور پروفیسر ظفر احمد نظامی کے نام ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

''اپنے اس پانچویں مجموعے کو معنون کرتا ہو صحافت کی بے غلاف شخصیت، زبان و ادب اور بشر دوستی کے ممتاز فکشن نگار نند کشور وکرم اور مقبول نثر نگار، شاعر، افسانہ نویس اور قلمی چہرہ کے موجد پروفیسر ظفر احمد نظامی کے نام۔

نام و نمود سے بے نیاز یہ دونوں تخلیق کار آخری سانس تک میرے دل کی دھڑکنوں میں شامل رہیں گے۔'' [۳]

---

۱ اگنی پریکشا۔ از نعیم کوثر۔ ص ۲۵
۲ مورخہ ۲۷/اکتوبر۔ ۲۰۰۸ء کا مطبوعہ خط ''لفظ شناس''۔ مرتب: رشید انجم۔ ص ۱۳۱
۳ آخری رات کا انتساب۔ از نعیم کوثر

اس مجموعے ''آخری رات'' کے افسانے بھی نعیم کوثر کے منفرد انداز اور سماج کے زخموں کی نمائش کے ساتھ نہایت رحم دلی اور انصاف پسندی کے ساتھ خوبصورت اور پر اثر ہیں سماج کے سفاک چہرے کو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں آئینہ دیکھایا ہے ان کے دیگر افسانوی مجموعوں کی طرح اس مجموعے کو بھی سنجیدہ قارئین اور ناقدین نے بہت سراہا ہے۔ اس مجموعے کے یوں تو تقریباً تمام ہی افسانے افسانہ نگاری کے فن پر کافی حدتک کھرے اترتے ہیں لیکن درج ذیل افسانے اپنی مثال آپ ہیں:

''ممتا کی انگڑائی''گیان کا مندر'' ''نجات'' ''رتی لال'' ''خدائی خدمت گار'' ''چمتکار''اور''آخری رات''وغیرہ۔

چنانچہ''ممتاز کی انگڑائی''اس مجموعہ کا بہت پر اثر اور حقیقت پر مبنی افسانہ ہے۔ جس میں قدیم پٹھانوں کی شجاعت اور سر بلندی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار حشمت خاں کا تعلق اعلیٰ فیروز خیل شاخ میرازی افغانی پٹھانوں کے خاندان سے تھا۔ جنہوں نے تلوار کے جوہر دکھائے اور ہمیشہ سر بلند رہے۔ نعیم کوثر نے اس خاندان کے پیڑھی در پیڑھی کئے گئے بلند ہمتی اور شجاعت کے کئی اہم واقعات بیان کئے ہیں۔ اس پیڑھی کا آخری شخص بھی اپنی بہادری کا جھنڈا اپنے محلّہ میں گاڑ دیتا ہے۔ جس محلّہ کا دادا اور ہنومان اکھاڑے کا مکھیا لال جی پہلوان محلّہ میں رہنے والی ایک طوائف رکمنی کو بے دردی سے مار ڈالتا ہے اور اس کے مکان پر قبضہ کر لیتا ہے یہ مکان اسے ملک کے بٹوارے کے وقت کسٹوڈین کے ذریعہ مہاجروں کو دیئے گئے مکانوں میں تھا جسے رکمنی کی ماں نے ممتاز علی رنگریز سے پیسے دیکر خرید لیا تھا اس ظلم پر محلّہ کے سب لوگ خاموش رہتے ہیں لیکن حشمت خاں اس سے الجھتا ہے اور احتجاج کرتا ہے۔ حشمت خاں کی بیوی رکمنی کی ۱۰ سالہ بیٹی کو لے جاتی ہے وہ خود اولاد سے محروم تھی۔ اس بچی کی وہ بیٹی کی طرح پرورش کرتی ہے۔

یہ کہانی نہ صرف پٹھانوں کی حق پسندی اور بلند کرداری کو ظاہر کرتی ہے بلکہ ایک ماں کے دلی جذبات کا سچا اظہار بھی کرتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ممتا کی آواز مذاہب کی بلند دیواروں سے بہت اونچی ہوتی ہے۔

نعیم کوثر کے افسانوی مجموعہ'' آخری رات'' کے افسانے''ممتا کی انگڑائی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مصنف شمیم طارق اپنے مضمون''نعیم کوثر کی کہانی ''ممتا کی انگڑائی'' پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں:

> ''ممتا ایک آفاقی جذبہ ہے۔ یہ ہندو مسلمان، اپنے پرائے اور بعض حالات میں انسان اور جاندار میں بھی تفریق نہیں کرتی۔ ایسے واقعات کثرت سے بیان کئے جاسکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے موذی جانوروں کے اور موذی جانوروں نے انسانوں کے بچوں کی پرورش اور حفاظت کی ہے۔ کہانی کا اختتام کہانی کار کا یہ اعلان ہے کہ وہ تمام تر فرقہ واریت، لوٹ کھسوٹ اور قتل وخون کے باوجود انسان خاص طور سے عورت کی فطرت ((ممتا)) سے مایوس نہیں ہے۔ وہ منافرت پر محبت کے جذبے کو ترجیح دیتا ہے۔''[۱]

افسانوی مجموعے'' آخری رات'' میں ایک کہانی ''گیان کا مندر'' کے نام سے شامل ہے۔اس کہانی میں نعیم کوثر نے بڑے انوکھے انداز میں تعلیم نسواں کی طرف توجہ دلائی اور یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ نیک لوگ نیکیاں چھپ کر کرتے ہیں جن کا اثر بہت دیرپا ہوتا ہے۔

اس کہانی میں صوبیدار سلطان شاہ کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کا نوکر اختر ہر مہینے صوبیدار صاحب (سلطان شاہ) کے بینک اکاؤنٹ سے پینشن کے پیسے نکالنے جایا کرتا تھا۔ پیسے نکالنے کے بعد ان

---

[۱] نعیم کوثر کی افسانوی کائنات۔مرتب اقبال مسعود۔ص۸۹

پیسوں میں سے ۵۰ روپئے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیتا تھا اور باقی پیسے صوبیدار صاحب کو دے دیتا تھا۔ بینک میں کم جگہ تھی جس کے سبب اختر جب بھی پیسے نکالتا تو بینک مینجر رمیش پانڈے بار بار اس کی یہ حرکت دیکھا کرتا تھا۔ ایک بار بینک مینجر نے صوبیدار صاحب سے اختر کی شکایت بھی کی مگر انہوں نے کوئی اثر نہ لیا۔ گویا وہ اس کی اس حرکت سے واقف تھے۔ صوبیدار صاحب کے انتقال کے بعد ان کا تمام ترکہ بانٹ دیا اور ختم کر دیا۔ لیکن اختر نے ان کے مکان کو ان کے بچوں سے خرید لیا اور وہاں ''صوبیدار صاحب کے نام سے''سلطان شاہ یادگار اسکول'' لڑکیوں کا اسکول قائم کیا۔ ایک بار بینک مینجر رمیش پانڈے اتفاقاً اس اسکول کو دیکھتا ہے اور اختر سے ملتا ہے تو اسے اصلیت پتہ چلتی ہے کہ ہر مہینے پینشن کے بچائے گئے ۵۰ روپئے اور کچھ چندے کی رقم ملا کر صوبیدار کے بچوں سے یہ مکان خرید لیا اور ان کے نام سے یہ اسکول قائم کیا ہے۔ مینجر حیران رہ جاتے ہیں جب انہیں اختر کی اصلیت پتہ چلتی ہے۔ اختر انہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ لڑکیوں کا اسکول اس لیے قائم کیا ہے تاکہ ہمارے معاشرے کی بچیاں تعلیم حاصل کریں اور اپنے بچوں کو بھی تعلیم یافتہ بنائیں۔ میری ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی اس لیے میں زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔

نعیم کوثر نے تعلیم نسواں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس افسانے کا اختتام بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''رمیش پانڈے نے کھسیاتے ہوئے پوچھا'' مگر تم نے لڑکیوں کا ہی اسکول کیوں کھولا''؟

اختر نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اگر خود اس کی ماں نے تعلیم حاصل کی ہوتی تو وہ زیادہ پڑھائی کر لیتا۔ ماں کی گود علم کا گہوارہ ہوتی ہے۔ آج کی پڑھی لکھی لڑکی کل ماں بنے گی تو گھر میں اپنے بچے کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا سکتی ہے۔

رمیش پانڈے کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ اختر کو سینہ سے لگایا
اور پرانے الزام کی معافی مانگی۔''[۱]

نعیم کوثر کا چھٹا افسانوی مجموعہ ''کہرے کا چاند'' ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۴/افسانوں پر مشتمل اس مجموعہ میں ۱۳۹ صفحات ہیں۔ اس مجموعے کے زیادہ تر افسانے، افسانے کے فن پر کھرے اترتے ہیں اور ان کا معیار بہت بلند ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے نعیم کوثر کے منفرد اندازِ بیان، زبان کی دلکشی اور اثر انگیزی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس مجموعے میں مشہور صحافی اور افسانہ نگار، ادیب اور شاعر اقبال مسعود کا ایک مضمون ''نعیم کوثر کے افسانے'' کے نام سے شامل ہے جس میں وہ اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نعیم کوثر ایک صاحب طرز افسانہ نگار ہیں اور صاحب طرز ہونا ہزاروں میں سے کسی ایک کے حصہ میں آتا ہے اور صاحب طرز بھی ایسا کہ دور سے پہچان لیا جائے کہ یہ نثر پارہ نعیم کوثر کا ہے۔ اس اعتبار و افتخار کے لیے انہوں نے بہت محنت کی، ان کے افسانوں میں امیجری سے کیفیت کو جگانا، کہانی کو مناظر سے ابھارنا اور وقت کے پوشیدہ جہت کو کہانی سے مربوط کر کے اس میں زبان و محاورے کی بجلیاں بھر کر اس کو فورڈائی مشین (چار جہتی) بنا دینا ان کا اسلوب ہے۔ وہ افسانہ نگاری میں اپنی انفرادیت قائم کرنے اور اسلوب وضع کرنے میں کامیاب ہیں''[۲]

نعیم کوثر کے افسانوں کے موضوعات کے تحیر خیز بیان میں قاری اس طرح گم ہو جاتا ہے اور کہانی کے اختتام تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد افسانوں کے بارے میں غور و فکر میں کھو جاتا ہے۔ نعیم کوثر کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی مضمون بعنوان ''نعیم کوثر کے افسانے'' میں اقبال مسعود مزید لکھتے ہیں:

---

۱ آخری رات۔ از نعیم کوثر۔ ص ۶۶
۲ نعیم کوثر کے افسانے۔ مطبوعہ کوہرے کا چاند۔ از نعیم کوثر۔ ص ۱۶

''نعیم کوثر اول تا آخر کہانی کار ہیں، انہیں داستان سرائی کا فن آتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کو کہانی کا اس آسانی سے حصہ بناتے ہیں جیسے باغوں میں پھول کھلتے ہیں جیسے تال پر آبی پرندے پرواز کرتے ہیں یقین ہے کہ وہ تمام جزئیات اور لوازمات کے ساتھ کہانی کو ندی کی طرح بہنے دیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں آج کی بھی ہیں اور کل کی بھی اور آنے والے زمانوں میں بھی وہ قاری کے درِ دل پر دستک دیں گی۔ اسے سوچنے، غور وفکر کرنے پر آمادہ کریں گی اس لیے بھی کہ ان کی تخلیقات میں مقامی رنگ ہوتے ہوئے بھی آفاقیت اپنی جھلک دکھاتی ہے وہ پرانے موضوعات جیسے فسادات یا ہجرت پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ جگمگا اٹھتے ہیں اور بالکل نئے اور انسانی نفسیات سے ہم آہنگ اور ہم آمیز ہو جاتے ہیں۔''[۱]

نعیم کوثر کے افسانوی مجموعہ ''کہرے کا چاند'' میں شامل یوں تو تمام افسانے افسانہ نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند افسانے درج ذیل ہیں۔ ''روح کا سرگم'' ''خدائی فیصلہ'' ''تیسری آنکھ'' ''کہرے کا چاند'' ''سپنوں کے سوداگر'' ''الرٹ'' ''ہوئے ہم مرکے جو رسوا'' اور ''زاہد مکار'' وغیرہ۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ خدائی فیصلہ ''خاص طور سے اس لیے اہم ہے کہ اس کا موضوع بالکل نیا ہے۔

اس افسانہ کا مرکزی کردار شیخ نظیر پولس کا بہت پرانا مخبر ہے اسکا گزارا پولیس افسران اور محکمہ کے ذریعہ دی گئی رقم سے ہی چلتا تھا۔ اس کی بیوی مجیدن بہت دیندار اور خدا پرست تھی۔ وہ شیخ نظر کی چغل خوری کے نتیجے میں حاصل کی گئی رقم کو ناجائز سمجھتی تھی۔ شیخ نظیر کا ایک بیٹا تھا جس کا نام شیخ منیر تھا۔

---

[۱] ''نعیم کوثر کے افسانے''۔ مطبوعہ کہرے کا چاند۔ از نعیم کوثر۔ ص ۵

اس کی عمر تقریباً ۱۸؍سال تھی وہ ایک دن خوشی سے چیختا اور چھوٹے بچوں کی طرح اچھلتا ہوا ماں کے پاس آیا اور اس نے بتایا ہے کہ وہ آٹھویں میں اول نمبر سے پاس ہوا ہے۔ ماں بے حد خوش ہوئی اور اسے اس خوش خبری کے ساتھ شیخ نظیر کے پاس جانے کے لیے کہتی ہیں۔ شیخ نظیر بھی منیر کے پاس ہونے کی خوشی میں چیخ اٹھتا ہے اور اسے لیکر اپنے پیر حافظ شمشاد صاحب کے پاس پہنچتا ہے وہ خوش ہو کر منیر کو دعائیں دیتے ہیں۔ اور سر پر ہاتھ رکھتے ہیں اس کے بعد شیخ نظیر فوراً پولیس میں نوکری حاصل کرنے کے لیے منیر کی طرف سے ایک درخواست ٹائپ کرواتے ہیں اور بیٹے کو لیکر ایس پی نقوی کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ ایس پی صاحب نہایت سخت گیر اور بد دماغ انسان تھے شیخ نظیر کے ساتھ منیر کو دیکھ کر چڑ جاتے ہیں اور کڑک لہجے میں کہتے ہیں کیسے آئے شیخ نظیر بہت انکساری کے ساتھ التجا کرتے ہیں۔ یہاں نعیم کوثر نے پولیس والوں کی بد دماغی اور تلخ گوئی کی بہترین تصویر کشی کی ہے انہیں کے الفاظ میں دیکھئے:

> ''حضور، حضور'' نظیر نے فائل سے درخواست نکال کر بڑھائی یہ آپ کا غلام ہے۔ آٹھویں فرسٹ مہربانی ہو جائے۔ مقدر سنور جائیگا''۔ ایس پی نقوی نے درخواست پڑھی پیپر ویٹ سے دبائی بھیڑیئے سے دانت کٹکٹائے بتایا نوکریوں پر Ban ہے۔
>
> ناگواری کا اظہار کیا۔ حافظ شمشاد کے مرید ہو۔ جنات والے پیر ہیں۔ جسے دیکھو ان کے پاس فریاد لے جاتا ہے۔ بیٹی کی شادی کرا دو، بہن کو کینسر ہے، چار بکریاں گم ہو گئیں، بھائی کی پھانسی بچ جائے۔ لاٹری کا نمبر دلا دیں، تعویذ دیدیں سب دلدّر دور ہو جائیں۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں شیخ نظیر پسینہ میں نہا گیا کاٹو تو خون نہیں۔''[۱]

۱؎ کہرے کا چاند۔ از نعیم کوثر۔ ص ۳۶

شیخ نظیر بہت خوشامد کرتے ہیں پھر بھی جب ایس پی صاحب راضی نہیں ہوتے تو شیخ نظیر اپنی خدمات کا واستہ دیتے ہیں تو ایس پی صاحب جو پیری مریدی سے چڑھتے تھے کہتے ہیں :

''ایک شرط ہے۔تم حافظ شمشاد کے پٹے ہو۔تمہارا بیٹا جنت کی کوئی نشانی لادے۔اس کی نوکری پکی۔گیٹ آؤٹ''[۱]

شیخ نظیر اور انکا بیٹا منیر مایوس ہوکر گھر لوٹ آتے ہیں۔اور بے عزت شیخ نظیر کو بیٹے کی نوکری نہ لگنے کا بے حد صدمہ ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے ان کی صحت گرنے لگتی ہے۔منیر بھی ان کی صحت کا فکرمند ہو جاتا ہے۔ کچھ دن بعد محلے کا بچہ مجیدن سے کہتا ہے کہ منیر کا جھگڑا ہو گیا ہے۔اور کوئی اس کو مارر ہا ہے مجیدن گھبرا کر ننگے پاؤں منیر کو دیکھنے بازار پہنچ جاتی ہے۔وہ بارش میں بھیگ جاتی ہے اس کے پاؤں کیچڑ میں ہو جاتے ہیں۔منیر اچھا بھلا کھڑا کسی سے باتیں کررہا تھا۔مگر اب چکرا کر وہی گر جاتی ہے۔منیر بے ہوش ماں کو گود میں اٹھا کر گھر لاتا ہے اور کیچڑ سے بھرے ہوئے پاؤں اپنے رومال سے صاف کر لیتا ہے۔ ماں ہوش میں آکر کہتی ہے مجھے تیری گود میں سکون ملا۔ ماں تو ہر وقت میرے لئے نوکری کی دعا کرتی ہے۔ ماں اگر میری نوکری لگ جائیگی تو میں تمہیں گود میں اٹھا کر حج کراؤنگا۔ پھر ایک جمعہ کے دن منیر نماز کی تیاری کرتا ہے اور رومال جیب میں ڈالنے کو اٹھاتا ہے۔ یہاں نعیم کوثر نے یہ بتانے کی کوش کی ہے کہ منیر بہت نیک لڑکا ہے۔اس کی نگاہ میں ماں کے پیروں پر لگی ہوئی مٹی بھی اتنی پاک ہے۔ پہلے تو وہ اپنے رومال سے ماں کے پیر پونچھتا ہے بعد میں اسے زمین پر پھینکنے کے بجائے میز پر رکھ دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے اس مٹی کو رومال میں اٹھا کر تیز رفتاری سے ایس پی صاحب کے آفس میں پہنچ جاتا ہے یہاں بھی نعیم کوثر نے ماں کی محبت سے سرشار بیٹے کی ہمت کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچا ہے۔اسے دیکھ کر ایس پی صاحب غصے میں آجاتے ہیں :

---

۱ کہرے کا چاند۔از نعیم کوثر۔ص ۳۶

''کیوں؟ نقوی گرجا

منیر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جیب سے رومال نکالا۔ مٹھی بھر مٹی نقوی ایس پی کی ٹیبل پر بکھیر دی لمحہ بھر کو نقوی کا چہرہ سرخ ہوا، وہ سکتے میں آ گیا'' یہ کیا گستاخی ہے؟'' کچھ سوچا اور ایک دم اٹھا۔

جیسے سپرنٹینڈنٹ پولیس نہ رہا ہو۔ عام آدمی ہو۔ نقوی غصہ میں بپھرے، کرسی سے اٹھے۔ شیخ منیر بالکل نہیں گھبرایا۔ سینہ تان کر کہا۔

''حضور وعدہ نبھایئے۔ یہ ماں کے ان قدموں کی مٹی ہے۔ جس کے نیچے جنت ہوتی ہے۔''

نقوی کی بد دماغی، دبنگ پن، افسرانہ رعب و دبدبہ، سیّال بن کر بہہ گیا اُسے محسوس ہوا یہ مٹی نہیں خدائی فیصلہ ہے۔''[1]

نعیم کوثر نے اس افسانے کے ذریعہ سماج میں پھیلی ہوئی ضعیف الاعتقادی پر بھی زبردست طنز کیا ہے اور پولیس کے سخت رویہ پر بھی ضرب لگائی ہے۔ مخبر کی حیثیت سے شیخ نظیر کا کردار بھی بہت غضب ناک ہے جو اس کام کو بے حد دیانتداری کے ساتھ انجام دیتا ہے اپنی تمام زندگی کی محنت اور خوف اور ہراث کے ساتھ کئے گئے۔ مخبر کے کام میں پولیس کی بے حد مدد کرتا ہے لیکن پولیس والے کسی کے بھی نہیں ہوتے ضرورت کے وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتے۔ منیر اور مجیدن کے کردار ماں اور بیٹے کی سچّی محبت کے عبارت ہیں شیخ منیر ماں کی ہر وقت دل جوئی کرتا اور اس کو پوری امید ہے کہ وہ ماں کی دعاؤں کے اثر کے نتیجے میں ضرور حج کریگا اور ماں کو بھی حج کروائے گا۔ ایس پی صاحب نے منیر کی عقیدت اور ماں کی محبت کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ محبت کا پاکیزہ رشتہ اسے ایسی قوت عطا کر دیتا ہے کہ وہ ایس پی صاحب کے سامنے ماں کے پیروں کی مٹی ڈالکر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ جنت کی نشانی لے آیا اور ایس پی صاحب کو بے زباں کر دیتا ہے۔

---

[1] کہرے کا چاند۔ نعیم کوثر۔ ص ۴۵

نعیم کوثر کے افسانوی مجموعے ''کہرے کا چاند'' کا افسانہ ''تیسری آنکھ'' میں ماں کی قربانی کی کہانی بیان ہوئی ہے جس میں ماں اپنے بیٹے کی آنکھ خراب ہونے پر اپنی آنکھ بیٹے کو دے دیتی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار نجمہ ہے جس کی شادی ریلوے گارڈ مردان علی خاں سے ہوتی ہے۔ شادی کے بعد ایک بیٹا امتیاز علی پیدا ہوتا ہے کچھ عرصے بعد مردان علی ریل حادثے میں جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ نجمہ ان کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے محنت اور کفایت شعاری سے گھر کا نظام چلاتی ہے اور بیٹے کی پرورش بھی کرتی ہے کہ اس پر ایک نئی مصیبت آتی ہے امتیاز علی ایک حادثے میں اپنی آنکھ کھو بیٹھتا ہے اور ڈاکٹر کے کہنے پر نجمہ ماں کی محبت اور انتہائی حدتک قربانی دینے والا کردار نبھاتی ہے اپنی ایک آنکھ ڈاکٹر کے کہنے پر اپنے بیٹے کو دے دیتی ہے اور اپنے نوعمر بیٹے کو اس عظیم قربانی کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی اور خود مسلسل کانی کہلانے کی لعنت برداشت کرتی ہے کیونکہ ہمارے سماج میں ضعیف الاعتقادی ہے کانے انسانوں کو منحوس سمجھتے ہیں اور ان سے ملنا اور تعلق رکھنا گوارہ نہیں کرتے وہی سب کچھ نجمہ بھی سہتی ہے۔ اپنی بیوہ ماں کی کوششوں سے بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ نشرواشاعت میں پبلسٹی آفیسر کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس کی شادی کالج پروفیسر روحی سے ہو جاتی ہے۔ روحی بھی نجمہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور (کانی کانٹری) کہہ کر اس کی توہین کرتی ہے امتیاز علی بھی بجائے اپنی بیوی کو سمجھانے کے اپنی ماں سے بدسلوکیاں کرنے لگتا ہے۔ اب نجمہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ گھر چھوڑ کر اپنی بہن کے پاس چلی جاتی ہے۔ ادھر امتیاز علی ترقی کر کے محکمہ نشرواشاعت میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہو جاتا ہے اور اس کے پاس مبارک باد کے لاتعداد خطوط آتے ہیں۔ اسی درمیان انہیں اپنی خالہ کا خط بھی نظر آتا ہے وہ اسے کھول کر پڑھتے ہیں اس میں لکھا تھا:

''امتیاز بیٹے نجمہ آپا کا ۳ر جنوری کو انتقال ہو گیا۔ انہوں نے تمہیں

یہ بند لفافہ بھیجنے کی تاکید کی تھی۔''

امتیاز کی آنکھیں برسوں بعد نم ہوگئیں۔لرزتے ہاتھوں سے دوسرا لفافہ کھولا۔امی کی ہینڈ رائٹنگ وہ خوب پہچانتے تھے۔

''میرے لال بچپن میں ایکسیڈینٹ میں تمہاری دائیں آنکھ پھوٹ گئی تھی سیتا پور کے ڈاکٹرس نے میری دائیں آنکھ نکال کر تمہیں روشنی اور خوبصورتی دے دی تم سلامت رہو۔خوب ترقی پاؤ۔تمہاری امّی نجمہ''

امتیاز علی خاں کے منھ سے دلدوز چیخ نکل پڑی۔''[۱]

اس افسانے کے ذریعہ نعیم کوثر نے ماں کی عظمت محبت اور سچے خلوص کو پیش کیا ہے اور یہ بھی ظاہر کیا کہ اس کا دل کتنا بڑا ہوتا ہے کہ اپنے جسم کے سب سے قیمتی اعضاء آنکھ کو ہی اپنے بیٹے پر قربان کر دیتی ہے اور خود ایک آنکھ کے نہ ہونے کے سبب اپنے بیٹے بہو اور سارے سماج کے طعنے سنتی ہے اور کانی کانڑی کہلاتی ہے۔

یہاں تک کہ گھر بھی بیٹے بہو کے حوالے کر اپنی بہن کے یہاں چلی جاتی ہے۔آخر میں اپنے خط کے ذریعہ اپنی قربانی کا پتہ دیا اور بیٹے کو بہت شرمندگی کا احساس ہوا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

مجموعی طور پر اگر ہم دیکھیں تو نعیم کوثر عہد حاضر کے ایک بہترین افسانہ نگار ہیں اور صحافی بھی ہیں۔ان کی دونوں حیثیتیں اپنی جگہ مکمل ہیں اور اس کو مختلف ناقدین نے بار بار سراہا ہے۔دراصل بچپن سے انہیں ماحول ادبی ملا۔ان کے والد کوثر چاندپوری بہت بڑے ادیب تھے اور افسانہ نگاری پر خصوصی توجہ تھی۔اسی ماحول میں نعیم کوثر کی پرورش ہوئی وہ خود بھی قدرتی طور پر صلاحیتوں سے آراستہ

---

[۱] کہرے کا چاند۔از نعیم کوثر۔ص ۶۰

تھے اس لیے اپنے والد کی وراثت کو بحسن خوبی سنبھالا ہی نہیں بلکہ اس میں روز روز نئے نئے اختراع پسندی کے تجربے کئے۔

جس کے نتیجے میں ان کے ابھی تک کم و بیش چھ افسانوی مجموعے طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اورانہیں ایک بہترین افسانہ نگار کی حیثیت سے سارے ہندوستان بلکہ دنیا کے بیشتر مما لک میں جانا جاتا ہے۔نعیم کوثر کے افسانوں کا جائزہ گذشتہ صفحات میں ہم نے لیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھے تخلیق کار کی طرح اپنا ارتقائی سفر طے کرتے رہے اور ان کے معیار میں، ان کے موضوعات میں اور ان کے کرداروں میں کچھ نہ کچھ نیا پن جاگتا رہا۔ جیسے جیسے وہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھے گئے۔ ہر مجموعے میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی بہت محنت اس کے پیچھے ہے۔ وہ کائنات کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں وہ تمام لوگوں کے جو صنف سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ بھی تنقید سے متعلق ہیں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور کوشش ان کی یہ ہے کہ وہ ایک ذمہ دار افسانہ نگار کی طرح سماج کے مسائل کو پیش کریں اور کسی نہ کسی طرح اچھے سماج کی تشکیل میں مدد دے سکیں اس نظریہ کے پیش نظر انہوں نے گلی کوچوں سے بھی بالکل زمینی سطح سے موضوعات اور کردار لئے ہیں جہاں عام انسان کا پہنچنا بھی مشکل ہے اور سمجھنا بھی مشکل ہے لیکن نعیم کوثر بہت گہری نگاہ رکھتے ہیں۔

نعیم کوثر نے ان تمام چیزوں کو اتنی باریک نگاہ سے دیکھا ہے کہ اسکا کوئی پہلو ہوگا جو ان سے چھوٹا ہے اور غریبوں، کمزوروں اور پسماندہ طبقے کے جذبات سے ان کے کردار سے، ان کے مسائل سے گہری واقفیت انہوں نے حاصل کی ہے، ان تک پہنچنے کی پوری کوشش کی ہے اور ان کو پیش کرنے میں بہترین طریقے اختیار کئے ہیں بیانیہ انداز ان کا بہت متاثر کرتا ہے جو کہ اکثر افسانوں میں ہے اور زبان پر ان کی زبردست جو مہارت ہے وہ تمام ان کے ہر ہر جملے سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ وہ کہیں بھی اپنے جذبات کے اظہار میں کوتاہی نہیں کرتے اپنے کردار کی شخصیت کو پیش کرنے میں کمی نہیں کرتے بلکہ وہ اس

کے دلی جذبات، اس کی نفسیات، اس کے رشتوں کے قرب ان سب چیزوں کو وہ بیان کرتے ہیں اور بہت خوبصورت انداز سے بیان کرتے ہیں جو کہ متاثر کرتا ہے۔

اسی طرح موضوعات میں بھی آج کے عہد سے جڑے ہوئے بہت سے موضوعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور سماج کو آئینہ دکھایا ہے کہ سماج کس سمت میں جارہا ہے اور کیا اس میں خامیاں خرابیاں مسلسل پیدا ہوتی جارہی ہیں۔انہیں دور کرنے کی کوشش کرنی ہوگی اگرنہیں کریں گے تو ہم یقیناً اپنے اس خوبصورت سماج کو اس سرزمین کی جوعزت ہمارے سپرد کی ہے جہاں مذہب کو بہت احترام دیا جاتا ہے، جہاں چھوٹے بڑے کی قدر کی جاتی ہے، جہاں رشتوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ جہاں بغیر یہ سوچے ہوئے کہ کوئی ہندو ہے یا مسلمان ہے،سکھ ہے یا عیسائی سب کی ایک دوسرے کے ذریعہ مدد کی جاتی ہے اوران کا ساتھ دیا جاتا ہے اور یہ بہت خوبصورت انداز سے بار بار انہوں نے دکھایا ہے۔ حالانکہ جوغنڈہ گردی مچی ہوئی ہے جو کرپشن ہمارے سماج میں ہے اس کو بھی انہوں نے پیش کیا ہے۔لیکن زیادہ تر ان کے افسانوں میں وہ دردمندی موجود ہے جو ہندوستان کا خاص طریقہ ہے۔ ہمارے سماج میں ہمیشہ سے جورویہ رہا ہے۔ عام انسانوں کا کچھ لوگوں کو چھوڑ کر جو کہ لالچی اور سنگ دل، سیلفش ہیں ان کے علاوہ ہمدردی، محبت، بھائی چارہ اور اخلاص یہ ہندوستان کی خاصیت ہے۔ یہاں کے سماج کی خاصیت ہے اسے نہیں چھوڑتے ہیں۔ جسے نعیم کوثر نے بار بار ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ہم کافی خسارے میں جارہے ہیں۔آج کل اس معاملے میں ان چیزوں کی ہمارے یہاں کمی ہورہی ہے جب تک آپ ان چیزون کو یادنہیں کریں گے آپ وطن کی محبت آپ کو پڑوسی سے جوتعلق، جورشتہ ہے اس کی اہمیت معلوم نہیں ہوگی جو آپ کے باہمی رشتے ہیں ان کی قدریں معلوم نہیں تو آپ ظاہر ہے کہ بھٹک جائیں گے یہ سب بتانے والا تخلیق کار ہوتا ہے، ناقد ہوتا ہے، افسانہ نگار ہوتا ہے، ناول نگار ہوتا ہے، شاعر ہوتا ہے۔ جتنے بھی تخلیق کار ہوتے ہیں ان کے پاس ایسا قلم ہوتا ہے کہ وہ بہت آسانی سے ان تمام چیزوں کو واضح

کر سکتے ہیں جو ہمیں نقصان پہونچانے کے لیے اب سرگرم ہیں۔ نعیم کوثر نے افسانوں کے ذریعہ ایسی چیزوں سے بچانے کی کوشش کی ہے وہ ایک بہت اچھے فکشن نگار ہیں۔ انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری طرح سے نبھانے کی کوشش کی ہے اور اسی لیے بہت سارے ناقدین نے، مفکرین نے، تخلیق کاروں نے اور قارئین نے بھی ان کی افسانہ نگاری کو سراہا ہے۔ اور اس پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ صرف یہاں یہ بات ظاہر کرنا مقصود ہے کہ نعیم کوثر ان تمام خصوصیات کے سبب افسانہ نگاری میں بہت کامیاب ہیں اور اچھے مقام پر فائز ہیں۔ بلکہ انہیں اس سے بھی بلند مقام ملنا چاہیئے۔

باب پنجم
نعیم کوثر بحیثیت صحافی ، بحیثیت ناقد

نعیم کوثر بحیثیت صحافی

صحافت یعنی جرنلزم، یہ ایک فن ہے ایسا فن جو زبان کی صوتیات Phonology اور الفاظ کی ساخت Morphology سے ترتیب پاتا ہے جس کے Term اور Form کی حد مقرر نہیں مگر یہ لامحدود بھی نہیں ہے۔ یہ بیک وقت Narrative art بھی ہے اور Vocal art کے ساتھ Discriptive art بھی ہے۔ اس فن میں کم سے کم الفاظ کے استعمال کے ساتھ طویل واقعات، حادثات اور انسانی نسبتوں کی حکایات کو اختصار کے ساتھ بیاں کیا جاتا ہے۔

صحافت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پرنٹ میڈیا یعنی مطبوعہ صحافت اور الیکٹرانک میڈیا یعنی جسے بیک وقت اسکرین (پردۂ فلم) پر دیکھا بھی جاسکے اور سنا بھی جاسکے۔ صحافت کو ادب سے دور رکھا گیا لیکن ایک تحقیق کے مطابق مغربی زبان وعلم کا باشعور مفکر جیک لنڈن وہ پہلا صحافی تھا جس نے ادب اور صحافت کی حد بندی کو شمار کر کے صحافت کو ادب سے جوڑنے کا ناقابل فراموش فرض انجام دیا تھا اور آج خواہ کسی بھی زبان کی صحافت ہو، اسے ادب سے علیحدہ نہیں مانا جاسکتا۔ صحافی کے لیے لازم ہے کہ وہ زبان، علم اور حالاتِ حاضرہ کا معلم ہو۔ مطبوعہ صحافت میں صحافی کا تخلیق کار ہونا لازم ہے چونکہ صحافت تشہیری اور ترسیلی عمل کی تائید کرتی ہے۔ اس کو اس طرح سمجھا جائے کہ مطبوعہ صحافت خبررسانی سے قریب ہوتی ہے۔ اگر اس کے کچھ صفحات ادب عالیہ کے لیے بھی مختص کئے جاتے ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین، تخلیق کا انتخاب اور اس کی اشاعت وہی شخص کرسکتا ہے جو ادب اور ادبی زبان کا علم بھی رکھتا ہو اور صحافی شعور بھی۔

''یوں تو مطبوعہ صحافت سے قبل خبروں کی فراہمی اور اشاعت کے طریقہ کے بارے میں تحقیق اور تلاش کا سلسلہ جاری ہے لیکن اب تک کی معلومات کے مطابق یہ بات ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سب سے پہلے فراعنہ مصر نے تصویری رسم الخط میں یہ حکم دیا تھا کہ اُن دستاویزوں کی ایک نقل پتھر پر کندہ کر کے معبد (عبادتگاہ) کے دروازے کے باہر نصب کر دی جائے تا کہ سب لوگ اسے پڑھ سکیں۔ اس طرح دنیا کا پہلا خبر نامہ معرض وجود میں آیا۔ جو پتھر پر کندہ کر کے مصر کے معبد کے باہر نصب کیا گیا۔ یہ سلسلہ ہزاروں سال کا سفر کرتا ہوا جب ہندوستان پہنچا تو......زبانوں کا تصویری رسم الخط ترقی کرتا ہوا حرفی رسم الخط کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کا ثبوت اشوک کے کتبات ہیں جو پتھروں پر کندہ آج بھی ہماری قدیم تہذیب کی عظیم وراثت کا درجہ رکھتے ہیں۔''[۱]

تاریخی شواہد کی روشنی میں ہندوستانی قدیم نظامِ حکومت میں خبروں کی اشاعت کا آغاز جاسوسی اور اس سے اخذ کردہ خبروں کی خفیہ فراہمی سے ہوا۔ اس کی تصدیق قدیم ہندوستانی تہذیب وتمدن کے اہم رکن منواسمرتی اور کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں بھی ملتی ہے کوٹلیہ انتہائی دانشمند سیاستداں اور چندرگپت موریہ کا وزیراعظم تھا یہ تین مختلف اور آزاد ذرائع سے سلطنت کی خبریں حاصل کرتا تھا۔ چونکہ اس نظام میں وہ اس قدر سخت تھا کہ خبر رسانوں کو ان کی معمولی غلطی پر بھی سخت سزائیں دیتا تھا۔ اس لیے اس تک انتہائی معتبر خبریں پہونچتی تھیں۔ اس کی تصدیق اس دور کے غیر ملکی سیاحوں اور میگستھنیز اور ایران کے سفرناموں سے بھی ہوتی ہے سمراٹ اشوک کے دورِ حکمرانی کے خبر رسانوں

۱؎ مدھیہ پردیش میں اردو صحافت۔ تالیف۔ محمد قمر جمالی اور شوکت رموزی۔ ص ۱۴۔۱۵

یا نامہ نگاروں کو پلسانی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ خبروں کے حصول کے لیے فاحشہ عورتوں کا استعمال کرتے تھے پلسانی ایک خفیہ رسم الخط میں لکھتے اور تربیت یافتہ کبوتروں کے ذریعہ انہیں منزلِ مقصود تک پہونچا دیتے تھے۔ یہیں سے خبر ناموں کی ابتداء ہوئی۔ تاریخ ہند اور دیگر تاریخوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ حصول خبر رسانی کا نظام غزنوی خاندان کے عہد میں رائج ہوا لیکن دہلی کے سلطانوں کے عہد حکومت میں اس نظام کو استحکام حاصل ہوا۔ سلطان بلبن نے اپنے تمام جاگیروں اور سلطنت کے تمام اہم شہروں اور قصبوں اور دیہاتوں میں اپنے وقائع نگار مقرر کئے تھے اور یہ خیال رکھا تھا کہ کسی بھی وقائع نگار کے زیرنگرانی اتنا بڑا علاقہ نہ کیا جائے کہ اسے معلومات فراہم کرنے اور انہیں سلطنت دہلی تک پہونچانے میں دقّت بھی پیش آئے اور وقت بھی صرف ہو۔

نامہ نگاری کی یہ تمام تفصیلات ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں مرقوم ہیں۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں چندر گپت موریہ کے نظام خبر رسانی کی مانند خبریں حاصل کی جاتی تھیں۔ محمد بن تغلق نے اس نظام کو مزید استحکام بخش کر اسے اور فعال بنایا تھا۔ شیر شاہ سوری کے قلیل عہد حکمرانی میں خبروں کے اس نظام میں گھوڑ سواری کی رفتار کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ''واقعاتِ مشتاقی'' میں اس کی تفصیل اس طرح درج کی گئی ہے:

> ''حسین خاں طشت دار کو بنگال سے ایک ضروری کام پر بھیجا گیا۔ اس نے دن رات سفر جاری رکھا۔ جب نیند آتی وہ چار پائی پر لیٹ جاتا اور دیہاتی اس چار پائی کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلتے جب نیند کھلتی تو وہ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ دوڑتا اس طرح وہ چتوڑ سے ''گور'' تک تین روز میں پہنچا۔ تصوّر کیجئے وہ کتنا بڑا فاصلہ ہے، ان دونوں شہروں کے درمیان آٹھ سو میل کا فاصلہ ہے۔''[1]

---

[1] بحوالہ واقعاتِ مشتاقی۔ مدھیہ پردیش میں اردو صحافت۔ تالیف محمد قمر جمالی اور شوکت رموزی۔ ص ۱۷

مغل دورِ حکمرانی میں بھی خبر رسانی کا یہی نظام رائج رہا۔ بابر اور ہمایوں نے تو اس میں اصلاح نہیں کی مگر شہنشاہ اکبر نے خبر رسانی کے اس نظام میں اصلاحات کیں اور اسے ایک جامع نظام سے وابستہ کیا۔ ان تیز رفتار خبر رسانی کے بروقت حصول کا مقصد یہ تھا کہ کوئی بھی محکمہ بد دیانتی کی طرف مائل نہ ہو۔ ہر ملازم سلطنت سے بے خوف ہوکر اپنے فرائض منصبی ایمانداری اور پورے اعتبار کے ساتھ انجام دے۔

عہدِ مغلیہ میں وقائع نگار دربار میں پابندی سے تمام درباری رودادیں اپنے روزناچوں میں درج کرتے تھے۔ ان رودادوں میں چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی قلم بند کیا جاتا تھا اور ہر دوسرے دن عام دربار میں اس روزناچے کو بلند آواز سے پڑھا جاتا تھا۔ مغلیہ سلطنت کی باج گزار اور ریاستیں اور سلطنت کے مقرر کردہ امیروں، جاگیرداروں اور صوبیداروں کے نمائندے دربار میں حاضر رہ کر ان روزناچوں کو بغور سنتے اور انہیں اپنے آقاؤں تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر نے اپنی نگرانی میں ''داروغہ ڈاک چوکی'' کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا تھا جو ایک قابل افسر کی زیرِ نگرانی رکھا گیا تھا اس اخباری تنظیم میں شاہی فوجی مہمات کی اطلاعات کے علاوہ سیاسی، معاشرتی، تجارتی اور زرعی خبریں ہوتی تھیں اور انہیں عوام کے لیے مشتہر کیا جاتا تھا۔ یہ خبریں اس لحاظ سے نظامِ سلطنت کے امور کی انجام دہی کے لیے بہت مفید ہوا کرتی تھیں۔ سلطنت کا طول وعرض بہت وسیع تھا اور دور دراز علاقوں میں جو بدعنوانیاں ظہور میں تھیں تو ان کی فوراً روک تھام کر لی جاتی تھی۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں اخبار نویسی کے فن کو عروج حاصل ہوا اور یہ فن سارے ملک میں پھیل گیا۔ اس عہد کی تاریخوں میں اخبار نویسی اور واقعہ نگاری کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے اخبار نویسی کے اس فن نے ابھی اعلیٰ مدارج طے نہیں کئے تھے۔ یہ اخبار دراصل دربارِ دہلی کے اخبار کی نقل ہوا کرتے تھے یہ نقول ملک کے

دور دراز علاقوں تک انتہائی تیز رفتاری سے ہر روز پابندیٔ وقت سے پہنچائی جاتی تھیں۔ان خبر رساں تنظیمات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خبر رساں۔وہی فرائض انجام دیتے تھے جو آج بھی جدید صحافت مطبوعہ اخبارات کے ذریعہ انجام دیتی ہے۔

صحافت سے متعلق تمام تاریخ شواہد سے یہ امر پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی تک تمام مطبوعہ اخبارات (یعنی نقول) کے لیے خبروں کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ وہ قلمی اخبارات تھے جو مختلف درباروں کے سرکاری واقعہ نویس ترتیب دیا کرتے تھے البتہ جب پریس قائم ہوئے اور اخبار کی طباعت شروع ہوئی تو اردو اخبارات کا دوسرا سب سے بڑا ذریعہ وہ انگریزی اخبار تھے جن سے غیر ملکی خبر اخذ کی جاتی تھیں۔اور اس کے ساتھ ملکی خبریں بھی ان اخبارات میں شائع ہو جایا کرتی تھیں۔

ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز ۱۸۲۳ء سے ہوا تھا۔کلکتہ سے منشی سدا سکھ کی ادارت میں ہندوستان کا پہلا اردو اخبار ''جام جہاں نما'' شائع ہوا۔یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ راجہ رام موہن رائے کا اخبار ''مراۃ الاخبار'' اپریل ۱۸۲۲ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکا تھا۔مگر چونکہ یہ اخبار صرف فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا اس لیے اسے اردو اخبار تسلیم نہیں کیا گیا ''جامِ جہاں نما'' کے چونکہ پبلشر انگریز تھے اس لیے اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ترجمان کہا گیا۔

اردو کا تیسرا اخبار ''شمس الاخبار'' بھی ماسٹر موہن متر کی ادارت میں کلکتہ سے جاری ہوا۔شمالی ہند کے پہلے اردو ہفتہ روزہ کا نام ''دہلی اردو اخبار'' تھا جسے سید حسین نے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا تھا جو دہلی سے نکالا گیا تھا دہلی سے ہی دوسرا اخبار ''سید الاخبار'' بھی ہفت روزہ تھا جو ۱۸۳۸ء میں شائع ہوا۔اسی اخبار میں سرسید احمد خاں کے ابتدائی مضامین کے علاوہ ان کی مشہور زمانہ تصنیف '' آثار

الصنا دید' ' کے پہلے ایڈیشن بھی شائع ہوئے تھے۔آہستہ آہستہ اخبارات کی طباعت و اشاعت کا نظام زور پکڑتا گیا اور پھر تیزی سے اخبارات کی ترسیل میں اضافہ ہوگیا۔ان اخبارات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے غاصبانہ قبضۂ ملک پرنکتہ چینی بھی کی جاتی ۔سماجی خرابیوں کے خلاف بھی مجاہدانہ مضامین شائع ہوتے تھے ۔قوم کی اصلاح اور مجلسی بدعنوانی کے خلاف بھی ان مضامین میں کھل کرلکھا جا تا تھا۔ابتداً یہ اخبارات آزادانہ لکھتے رہے مگر۱۸۲۳ء میں پہلی بارکلکتہ میں پریس ایکٹ قانون نافذ ہوا جس کی رو سے اخباروں اور کتابوں کی اشاعت اور مطبع جاری رکھنے کے لیے لائیسنس کا حصول ضروری قرار دیدیا گیا۔

کلکتہ کے بعد شمالی ہند میں اردو اخبارات کی اشاعت وطباعت کا سلسلہ قائم ہوا تو شمالی ہند کے صوبہ مدھیہ بھارت کے شہر گوالیار سے ۱۸۴۰ء میں پہلا اردو اخبار ''گوالیار اخبار'' کے نام سے طبع ہوکر منظر عام پر آیا۔آزادی کے بعد جب صوبہ جات کی جغرافیائی اور سیاسی تشکیلِ نو ہوئی اورصوبہ مدھیہ پردیش نقشۂ ہند پر معرض وجود میں آیا تو ''گوالیار اخبار'' کو ہی مدھیہ پردیش کا پہلا اردو اخبار تسلیم کیا گیا۔اس اخبار کے مدیر لکشمی پرشاد اور خیراتی لال تھے۔

جہاں تک بھوپال میں اردو صحافت کا تعلق ہے۔نواب شاہ جہاں بیگم کے عہدِ حکومت میں ۲۴/مارچ۔۱۸۷۱ء[1] کو ریاست بھوپال سے پہلا باقاعدہ اردو اخبار ''عمدۃ الاخبار'' جاری ہوا۔اس اخبار کے مدیر حکیم اصغر حسین اخگر فرخ آبادی تھے۔یہ اخبار مطبع سکندریہ بھوپال سے عبدالمجید کی نگرانی میں شائع ہوا۔اس اخبار کو قبولِ عام ملا تو اخبارات کی اشاعت کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔

ریاست بھوپال انگریزی حکومت کی تابع فرمان تھی اور اس کی پالیسی کے خلاف نہیں لکھا جا سکتا تھا۔اس لیے ''عمدۃ الاخبار'' میں سیاسی،افادی،سماجی،معاشرتی،سائنسی علوم،طبی،ادبی اور مذہبی

---

[1] اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ۔از ڈاکٹر سلیم حامد رضوی۔ص۱۳۹

سرگرمیوں کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اور دیگر علم و فنون سے متعلق مضامین مختصراً پیش کئے جاتے تھے۔بھوپال سے ۱۸۸۳ء میں ہفت روزہ اخبارہ ''صداقت'' عبدالکیرم اوجؔ کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس اخبار کی پالیسی حق گوئی، سچائی، حقیقت پسندی اور بے باکی پر مبنی تھی۔جس کے نتیجے میں حکومت کا عتاب نازل ہوااور عبدالکریم اوجؔ کو ریاست بھوپال سے جلا وطن کر دیا گیا۔عبدالکریم اوجؔ نے ہوشنگ آباد میں پناہ لی اور ۱۸۸۴ء میں ہوشنگ آباد سے انہوں نے ہفت روزہ اخبار ''موجِ نرمدا'' جاری کیا۔

ان چند ابتدائی اور اہم اخبارات کے بعد یہ سلسلہ مسلسل قائم رہا اور بھوپال سے جو روزنامے، ہفت روزہ، پندرہ روزہ اخبارات اور ماہنامے سہ ماہی اور چھ ماہی رسائل شائع ہوئے ان کی فہرست کافی طویل ہے چند اہم اخبارات اور رسائل کا ذکر درج ذیل ہے:

روزنامے:

''رہبر وطن'' ''ندیم'' (محمد الحسن صدیقی) ''ندیم'' (حکیم سید قمر الحسن) ''پرچم نو'' ''افکار'' ''حقیقت'' ''نیا بھوپال'' ''خورشید'' ''الحمراء''۔

سہ روزہ: ''بھوپال ٹائمز''

ہفت روزہ:

''دبیر الملک'' ''ہلال'' ''مظفری'' ''اخترِ ہند'' ''صفیر عام'' ''آواز'' ''صبحِ وطن'' ''کارواں'' ''رہنما'' ''نو روز'' ''ندیم'' ''مصوّر'' ''صبحِ وطن ثانی'' ''اصلاح'' ''کائنات'' ''احتجاج'' ''وکیل'' ''ترجمان'' ''شاہکار'' ''نیا بھوپال'' ''الحمراء'' (خلیل بدر) ''کارزار'' ''کردار'' ''پرچم'' ''نوجوان'' ''مزدور'' ''نئی راہ'' ''سوچنا'' ''ترجمان'' (جوہر قریشی/قمر جمالی) ''نیا بھوپال'' ''(چھگن مل/ ودود صدیقی) ''پرچم'' (طالب قریشی) ''ساچار'' ''ترجمان نو'' ''کاشتکار'' ''نئی راہ'' (چھگن مل ۱۹۵۲) ''روزگار'' ''بے باک'' ''نیا دور'' ''آفتاب'' ''نیا سماج'' ''راہی'' ''فدائے وطن'' ''سیہور سماچار'' ''نیا

دور'' (خان شاکر علی خاں) ''نیا سفر'' ''راجدھانی'' ''بھوپال ٹائمز'' ''نوائے بھوپال'' بھوپال پنچ'' ''رفتار'' ''الجبل'' ''سرمایہ'' ''شیشہ وسنگ'' ''ایاز'' ''اردو ایکشن''۔

پندرہ روزہ:

''مالوہ ریویو'' ''آرٹ اینڈ کلچر'' ''شعلہ حیات'' ''جست'' ''نشانِ منزل'' ''صدائے اردو''۔

بھوپال کے ادبی رسائل:

''والا جاہی'' ۱۸۸۲ء پہلا ادبی رسائل۔ سہ ماہی ''گلبن سخن'' ماہنامہ ''گلِ رعنا'' ''مہر منیر'' ''الحجاب'' ''ظلاالسلطان'' ''ندیم'' ''نگار'' ''زرنگار'' ''بانو'' ''مہارت'' ''خدّام وطن'' ''بصائر'' ''اولڈ بوائے'' سہ ماہی ''گوہر تعلیم'' ''گہوارۂ ادب'' ماہنامہ ''افکار'' ماہنامہ ''جادہ'' ''معیار ادب'' ''جگنو'' ''نور'' ''کردار'' ''کاروانِ ادب''۔[۱]

بھوپال میں صحافت کے اس ارتقائی سفر کو جاری رکھنے میں اور بہتر سے بہتر رُخ دینے میں اس سرزمین کے بہت سے صحافیوں کا حصہ رہا ہے جن میں حکیم اصغر حسین اخگر فرخ آبادی، عبدالکریم اوجؔ، ارجمند خاں سلیمؔ، محمد یوسف قیصر بھوپالی، حکیم سید قمر الحسن، نیاز فتح پوری، خلیل بدر، محمود الحسن صدیقی، سعید اللہ خان رزمی، قدوص صہبائی، عبدالکریم قریشی، محمد شریف عزمی، وٹھل داس، خان شاکر علی خاں، رتن کمار، جوہر قریشی، اے آر رشدی، صہبا لکھنوی، کوثر چاند پوری، شوکت رموزی، قمر جمالی، طالب قریشی، سلیمان آرزو، عابد حسین فاروقی، یوسف قریشی، مقصود عرفان، محوی صدیقی، عارف بیگ، اشفاق مشہدی، غضنفر علی خاں، قمر اشفاق، محمد مسلم، محمود الحسینی، اشتیاق عارف، مقصود عمرانی، صغیر بیدار، عیسیٰ صدیقی، مظفر رئیس، انصار النظر، مقصود اصغر، نعیم کوثر، عارف عزیز، کوثر صدیقی، اقبال مسعود اور ڈاکٹر نظر محمود خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ بھوپال ادب کے آئینے میں۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۱۰۱۔۱۱۵

صحافت کے میدان میں نعیم کوثر کافی پرانے ہیں جب وہ افسانہ نگاری کی ابتداء کر رہے تھے اور بچّوں کے ادب پر بھی ان کی توجہ تھی۔ ایسا سوچا جا سکتا ہے کہ یقیناً صحافت کے میدان میں نعیم کوثر کو سرگرم کرنے میں ان کے والد کی تحریک بھی شامل رہی کیوں کہ انہوں نے بھی بھوپال سے رسالہ ''جادہ'' ۱۹۴۶ء میں جاری کیا جو کافی مقبول ہوا۔

نعیم کوثر نے دوسروں سے الگ ہٹ کر صحافت میں نیا میدان منتخب کیا اور بچّوں کے رسالے سے صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اگر چہ بچوں کا رسالہ نکالنا آسان کام نہیں۔ بچوں کے ناپختہ ذہن کی تربیت اور ان کے ناپختہ شعور کی تعمیر، تخلیق، ترتیب اور بڑھتی عمر کو مدنظر رکھ کر ایسی کہانیوں، مضامین اور تحریروں کا انتخاب کرنا جو اصلاحی،، اخلاقی زندگی کے آداب، پابند شرع اور ضابطہ اخلاص سے آراستہ ہوں۔ ان مقاصد پر غور وخوض کرتے ہوئے نعیم کوثر نے ۱۹۵۹ء میں بھوپال سے بچّوں کا رسالہ ''جگنو'' جاری کیا۔ جو 20x30/16 کے 36 صفحات پر مشتمل تھا۔

نعیم کوثر نے اردو کے مقبول و معروف شاعر، ادیب، محقق، ناقد اور افسانہ نگار پروفیسر مظفر حنفی (مرحوم) کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مضامین تازہ'' پر اپنے پرچہ ''صدائے اردو'' کے ۱۶ اپریل ۱۵ مئی ۲۰۱۰ء کے شمارے میں تبصرہ کیا ہے۔ جس میں بچّوں کے رسالہ ''جگنو'' کے اجراء کے سلسلے میں نعیم کوثر خود لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۹ء میں مظفر حنفی نے کھنڈوہ سے ''نئے چراغ'' نام کا ادبی مجلّہ نکالا
> اور اسی سال میں نے بھوپال سے بچوں کا رسالہ ''جگنو'' کا اجراء کیا تھا۔''[۱]

نعیم کوثر کی ادارتی معاونت ان کے حقیقی بہنوئی پروفیسر ظفر احمد نظامی نے کی جو بذات خود عالم ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ معلم اور بے حد نفیس شخصیت کے مالک تھے بچّوں کے اس رسالے کی باتصویر اشاعت کے مصوّر ایم ایچ قریشی تھے۔

---

[۱] پندرہ روزہ صدائے اردو۔ ۱۶/اپریل۔ ۱۵/مئی ۲۰۱۰ء۔ ص ۱۲

نعیم کوثر نے ''جگنو'' کے ابتدائی اداریہ میں ہی اپنی صحافت کے فن پر مہارت کا ثبوت دیا انہوں نے اسے ''پہلی منزل'' کے نام سے موسوم کیا۔اس میں سب سے پہلے ملک وقوم کے معصوم نونہالوں کو نئے سال کی مبارک باد پیش کی اس کے بعد لکھا کہ یہ پہلا شمارہ ہے اس پرچے میں ہم نے مہنگائیوں کے اس بھیانک زمانے میں تمہارے چہروں پر تمتماہٹ اور مسکراہٹ پیدا کرنے کے لیے بھرپور سامان سمودیا ہے۔انہوں نے لکھا ہمیں توقع ہے کہ بچّے ''جگنو'' کے متعلق اپنی رائے سے ہمیں ضرور آگاہ کریں گے۔

''جگنو'' بچّوں کا ایک بلند معیاری ماہنامہ تھا۔کہانیاں، لطیفے، مذہب اور ادب سے واقفیت، وطنِ عزیز کی معتبر اور قدآور شخصیات کے حالاتِ زندگی کے دلچسپ پہلو، سرفروشانِ وطن پرستانہ داستانیں، ننھی منی نظمیں اور اصلاح سے بھرپور مضامین ''جگنو'' کے معیار کو بلند کرتے تھے بچوں کے ساتھ یہ رسالہ بڑوں میں بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔

''جگنو'' کے اندرونی صفحات پر کہانیوں اور دیگر مضامین کی مناسبت سے کارٹون اور فوٹو بھی شائع کئے جاتے تھے۔''جگنو'' کو لوگ شوق سے خریدتے اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔نعیم کوثر کی یہ کوشش تھی کہ یہ پرچہ ہر گھر تک پہنچے جہاں جہاں بچّے ہوں ان کے ہاتھوں تک اسے ضرور پہنچادیا جائے اور اپنی اس کوشش میں وہ بے حد اخلاص کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے۔یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے انہیں دورانِ تعلیم والد کی طرف سے جو جیب خرچ ملتا تھا اس کا بیشتر حصہ اور کبھی پوری رقم ''جگنو'' کی اشاعت پر صرف کردیا کرتے تھے اس دور میں صرف لیتھو پریس پر ہی طباعت ممکن تھی۔کاتب حضرات اجرت پر کتابت کرتے تھے نہایت محنت اور جانفشانی کے ساتھ تمام مضامین کہانیاں لکھنا اور دیگر ذرائع سے موصول ہوئے مضامین، لطیفے، کہانیاں اور شاعری کی تزئین ترتیب کاتب سے انہیں بٹر پیپر پر کتابت کرانا، ان کی ہر ممکن مدد کرنا اور پھر لیتھو پریس پر چھپوانا بڑی مشکل اور ذمہ داری تھی۔ یہ تمام کام نعیم کوثر اردو زبان، صحافت اور ادب اطفال سے قریبی تعلق ہونے کے سبب کرتے تھے۔

''جگنو'' چھپ کر آتا تو اس کی کاپیاں بک سیلروں کی دوکانوں پر پہونچانا بھی نعیم کوثر کی ذمہ داری تھی۔شہر چونکہ آبادی کے لحاظ سے وسعت اختیار تو کرتا جارہا تھا مگر سڑکیں،گلیاں اور بازاروں کا پھیلاؤ محدود تھا۔ بازاروں میں واقع گنی چنی بک سیلروں کی دوکانیں تھیں۔کمیشن پر یہ دوکاندار ''جگنو'' کے فروخت میں دلچسپی لیتے تھے۔''جگنو'' کی قیمت محض آٹھ آنے تھی اور اس آٹھ آنے کا ایک چوتھائی حصہ بطور کمیشن بک سیلروں کو چلا جاتا تھا۔ بہت قلیل حصہ بطور آمدنی نعیم کوثر کو حاصل ہوتا تھا۔اس کے علاوہ ''جگنو'' کی کچھ کاپیاں مفت ہی تقسیم ہو جایا کرتی تھیں۔طالب علمی کا زمانہ تھا۔ جیب خرچ کے علاوہ کوئی اور ذریعۂ آمدنی نہ تھا۔جس سے ''جگنو'' کی اشاعت کو مزید برقرار رکھا جاسکتا۔اس سنگین صورتِ حال کو نعیم کوثر نے خندہ پیشانی سے قبول کیا مگر جب آمدنی کے وسائل محدود ہو گئے تھے اور قرض لینے کی نوبت آنے لگی تو بحالتِ مجبوری بھوپال سے نکلنے والے اس دلچسپ معیاری اور افادی رسالے کو بند کرنا پڑا۔ ۱۹۵۹ء سے تقریباً ایک سال اس کی اشاعت پابندی سے ہوتی رہی''جگنو'' کے بعد بھوپال سے ایسا کوئی معیاری پرچہ جاری نہیں ہوا۔

ماہنامہ''جگنو'' کی اشاعت ۱۹۵۹ء کے بند ہونے کے تقریباً ۴۰ سال بعد نعیم کوثر نے پھر سے بھوپال کی صحافت میں قدم رکھا اور ۲۰۰۱ء میں ''صدائے اردو'' ۳۱ رفردوس کاٹیج،سیول لائن شملہ ہلس بھوپال سے پندرہ روزہ ادبی اخبار''صدائے اردو'' جاری کیا۔اس اخبار کے مالک پبلشر پرنٹر اور ایڈیٹر نعیم کوثر بنے۔ابتداً اس اخبار کی مجلسِ ادارت میں گھنشیام تومر، مصطفیٰ تاج، وحید پرواز اور کامل بہزادی کے نام شامل تھے۔ ملا احسان حسین آغاز سے ہی اس اخبار کے سرپرست رہے مصطفیٰ تاج نے کچھ عرصہ بعد اپنا نام ادارت سے واپس لے لیا۔اور اس کے بعد مجلسِ ادارت کے دوسرے ممبران رفتہ رفتہ الگ ہوتے گئے۔۲۰۰۳ء میں رشید انجم بطور معاون مدیر شامل ہوئے۔خصوصی

معاون کی حیثیت سے پروفیسر قاسم نیازی تاحیات شامل رہے۔ ۱۶صفحات کے اس اخبار کی قیمت ابتداء میں ۵ روپیہ فی شمارہ رکھی گئی تھی ۔۲۰۰۲ء سے ۸ روپیہ مقرر ہوئی اور پھر۱۰روپیہ فی شمارہ کردی گئی ۲۰۰۷ میں شاہنواز خاں معاون مدیر بنائے گئے تو رشید انجم خصوصی معاون کی حیثیت سے شامل رہے۔ یہ اخبار ملک کے اہم ترین شہروں کے علاوہ بیرونِ ملک یعنی نیویارک ،لندن، ماریشس اور پاکستان کے اردونواز حلقوں تک پابندی سے پہونچتا رہا۔

''صدائے اردو'' نعیم کوثر کی غیر معمولی صحافتی صلاحیتوں کے سبب اور اس وجہ سے بھی کہ وہ نہایت بے باک اور صاف گو، انصاف پسند، محبّ وطن اور سماجی ، سیاسی ، ادبی اعلیٰ ذوق رکھنے والے صحافی ہیں ۔اسی لیے ''صدائے اردو'' میں عموماً معیاری تخلیقات اور تبصرے شائع ہوتے تھے۔ بحیثیت مدیر وہ اردو زبان اور اردو ادب سے متعلق خبریں ہوں ، ادبی محفلوں کا ذکر ہو، زبان کی زبوں حالی کا ذکر ہو، اردو زبان کی حق تلفی کے خلاف انکا لہجہ ہمیشہ سخت ہوتا ہے۔''صدائے اردو'' میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی اور قدیم شاعری اور ادب کو بھی بھر پور جگہ دی جاتی تھی ۔

''صدائے اردو'' حب الوطنی کی طرف خصوصی طور پر مائل رہا وطن کی محبت سے بھرپور شعری نثری تخلیقات ''صدائے اردو'' کی ہمیشہ ہی زینت رہی نعیم کوثر یومِ جمہوریہ اور یومِ آزادی کے موقع پر خصوصی شمارے نکال کر حب الوطنی کا ثبوت دیتے رہے۔''صدائے اردو'' کے ذریعہ پورے ملک اور بیرونِ ملک کے اردو تخلیق کاروں کی وطن سے محبت کا اظہار کرتے رہے۔

نعیم کوثر نے ''صدائے اردو'' جلد ۷، شمارہ ۔۱، ۱۵؍اگست ۲۰۰۸ء کے اداریہ میں ان الفاظ میں جشن آزادی کی مبارک باددی ہے:

''ادارہ صدائے اردو'' جمہوریہ ہند کی ۶۱ ویں جشنِ آزادی پر ملک

اور صوبہ کے باشندگان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور خدا سے دعا کرتا ہے کہ ملک کو دہشت گردی اور فرقہ پرستی کے عذاب سے محفوظ رکھے''[۱]

''صدائے اردو'' کے ۱۵ اگست ۲۰۰۸ء کے شمارے میں وطن کی محبت سے سرشار تخلیقات شامل اشاعت ہیں۔ جس میں صفحہ اول پر محبوب احمد محبوب کی نظم ''جشن آزادی'' اور صابر ادیب کی نظم ''نغمہ آزادی'' شائع ہوئی ہیں۔ نظم ''نغمہ آزادی'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

''دوستی اخلاص و چاہت، ایکتا کی ایک بار
آؤ ہم مل جل کے پھر شمع جلائیں پر وقار
بغض و نفرت کے جو شعلے ہیں بجھا دیں گیں بہم
اک نئے انداز سے آئے وطن میں پھر نکھار

آج ہم دہرائیں پھر سے داستانِ رفتگاں!
پھر وطن کے گیتوں سے گونجیں زمین و آسماں
دیکھ کر اپنا وطن آزادئ خوش ہیں کس قدر
گل عذار و گل فشار و نازشِ ہندوستاں

لاکھ وا ہو حلقۂ دارورسن میرے لیے
لاکھ غم لائے زمانہ کا چلن میرے لیے
ہوں پریشاں گردشِ حالت سے صابر تو کیا
میں وطن کے واسطے ہوں اور وطن میرے لیے[۲]

---

۱ پندرہ روزہ صدائے اردو۔ ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء۔ ص۔۱

۲ پندرہ روزہ صدائے اردو۔ ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء۔ ص۔۱

نعیم کوثر اپنے پندرہ روزہ پرچے ''صدائے اردو'' میں محبّ وطن اور اعلیٰ رہنماؤں پر بھی معیاری مضامین اور خبریں شائع کرتے تھے۔ ساتھ ہی ''صدائے اردو'' میں محبِ وطن مسلم رہنماؤں پر شعری اور نثری تخلیقات بھی کثرت سے شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کا مضمون ''صدائے اردو'' ۱۵ر اگست ۲۰۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوا جس کا عنوان ہے:

''جنگِ آزادی کے عظیم سپہ سالار شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی''[۱]

''صدائے اردو'' ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اعتبار سے ایک مکمل اور معیاری پرچہ تھا چنانچہ اس میں ہماری قدیم شعری روایت کو بھی قائم رکھا گیا اور امیر خسرؔو سے لیکر چکبستؔ، اقبالؔ اور عصر حاضر کے نامور شعراء کے علاوہ نئے لکھنے والوں کو بھی موقع دیا جاتا تھا۔ نظمیں، غزلیں تضمین، قطعات، رباعیات وغیرہ سے ''صدائے اردو'' کا دامن رنگ برنگے پھولوں سے بھرا رہتا تھا۔ امیر خسرؔو کے کلام کی اشاعت نعیم کوثر کے اعلیٰ ذوق کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہاں امیر خسرؔو کی غزل کے چند اشعار نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملاحظہ کیجئے:

غزل (حضرت امیر خسرؔو)

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سوٗ رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم

پری پیکر نگارے سروقدّ لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بودشب جائیکہ من بودم

رقیباں گوش برآواز واَو اور در نازومن ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بودشب جائیکہ من بودم

۱؎ پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد ۷۔ شمارہ ۔۱، ۱۵ر اگست ۲۰۰۸ء۔ ص۔۱۰

خدا خود میر مجلس بوراندر لامکاں خسرؔو

محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم[۱]

''صدائے اردو'' میں ملک اور بیرون ملک کے اہم شاعر اور مصنفین کی تخلیقات اور اہم شخصیات پر مضامین باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں پاکستان کی ادبی اور نامور شخصیت مشفق خواجہ پر شاہد علی خاں (مرحوم) کے مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''میں تحقیق کے ذریعہ بزرگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

شاعری کرتا ہوں کہ خود اپنی ذات کو سمجھ سکوں۔

اور کالم لکھتا ہوں کہ اپنے عہد کے ادیبوں اور ان کی تخلیقات کے

بارے میں سچائیاں بیان کرسکوں (مشفق خواجہ)''

مشفق خواجہ دنیائے اردو ادب میں اپنے طرز کے یکتا ادیب گزرے ہیں۔ ایک محقق، نقاد اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ''خامہ بگوش'' کے نام سے جو طنزیہ کالم نگاری کی ہے وہ انہیں ممتاز حیثیت عطا کرتی ہے۔ ہندو پاک کے ادبی حلقوں کی ایک بڑی اکثریت خامہ بگوش کے کالم کی منتظر رہتی تھی۔ ہر کالم ایک نئے تنازعہ کا باعث بنتا تھا۔ پروفیسر ظفر نظامی نے ان کالموں کی عظمت کا یوں اعتراف کیا ہے:

''تمہاری رائے جاندار ہوتی ہے۔ ہر طرف شاندار ہوتی ہے۔

باقاعدہ کتاب خوانی کرتے ہو۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرتے ہو۔

ویسے لوگ یہ کہتے ہیں اسی خیال میں رہتے ہیں کہ جو کراچی گیا اس کی

---

۱ پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد ۶ شمارہ ۱۷۔ ۱۵/اپریل ۲۰۰۷ء۔ ص۱۴

شامت آئی جس نے کتاب لکھی اس پر قیامت آئی۔ خدالگتی کہتے ہو۔
تمہاری نیک نیتی زبان زد خاص و عام ہے، تمہاری نظر میں ہر شخص کا
احترام ہے۔تم لوگوں کا دل بہلاتے ہو، خود ہنسو نہ ہنسواوروں کو ہنساتے
ہو۔تمہاری تحریر میں طنز ہے مزاح بھی ہے۔ اختتام ہے اور افتتاح بھی
ہے۔تمہارا خامہ بڑا شائستہ ہے کبھی بادام کبھی پستہ ہے۔''

تحقیق اور شاعری جیسے سنجیدہ کام کے بعد آخر مشفق خواجہ کو کالم نگاری کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ فرماتے ہیں۔''اصل میں کالم نگاری میرا میدان نہیں ہے میرا مقصد اور منزل بھی نہیں ہے۔ یہ تو میرے راستے کے بہت سے منظروں میں سے ایک منظر ہے۔اگر کسی کتاب میں مجھے کوئی مضحکہ خیز بات نظر آتی ہے تو میں اس طرف اشارہ کر دیتا ہوں۔اس کا ذاتیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا یا اگر میں کسی غلط رجحان کی مذمت کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں۔کتاب''خامہ بگوش کی قلم سے'' کے دیباچے میں مصنف رقم طراز ہیں کہ''یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے جو بعض سنجیدہ مقاصد کے حصول کے لیے نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے:

''ہم جو لکھتے ہیں وہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔کیونکہ ہم سے وہ
لوگ عموماً ناراض ہوجاتے ہیں۔جن کو موضوع بنا کر ہم اظہار خیال کی
جرأت کرتے ہیں جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ہے۔ ان سب کے لیے
ہمارے دل میں احترام بھی ہے اور محبت بھی محبت میں چونکہ سبھی کچھ
جائز ہوتا ہے اسی لیے اس کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی آ گئی ہیں جنہیں
غالب کے لفظوں میں''سخن گسترانہ'' کہا جا سکتا ہے۔امید ہے ہماری یہ سخن

گستری آئندہ کے خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں
ہوگی۔خوشگوار تعلقات سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارے ممدوحین وہی کچھ
لکھتے رہیں جواب تک لکھتے رہے ہیں اور ہم ان کے لکھے پر بساط بھر اظہار
خیال کرتے رہیں۔ جب ہم ان کے لکھے کا برا نہیں مانتے تو انہیں بھی
ہمارے لکھنے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے ،۔'' [1]

''صدائے اردو'' میں ادبی مضامین اور شاعری کے علاوہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔نعیم کوثر نے ۱۵/اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے میں ملک کے نامور طنز مزاح نگار مجتبیٰ حسین (مرحوم) کا مضمون ''باتیں کتابوں کی'' کے عنوان سے شائع کیا۔اس مضمون کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ابنِ انشاء کے اظہار خیال کے بعد ہم اردو میں اشاعتی کاروبار کے
بارے میں اپنی ناچیز رائے کا کیا اظہار کریں۔دیکھا جائے تو خود ہماری
حیثیت بھی ایک سینئر ادیب کی ہوگئی ہے اور یہ کوئی تعلیٰ نہیں کہ کئی جونیئر اردو
ادیب ہماری اک نگاہ التفات کے منتظر رہتے ہیں۔ نہ جانے کتنوں کی یہ
خواہش ہوتی ہے کہ ہم ان کے رشحات قلم کے بارے میں کوئی تبصرہ کریں تو نہ
صرف ان کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل جائے بلکہ انکی کتابوں کے نسخوں
کی مفت تقسیم کے کاروبار میں بھی دن دونی رات چوگنی ترقی ہو۔ مانا کہ دنیا
کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں اور یہ ادیب مال و
دولت میں کھیلتے رہتے ہیں لیکن اردو زبان کا ادیب غالباً اکیلا ایسا ادیب ہے
جس کی قسمت میں فقر فاقہ اور توکل وقناعت کی دولت لکھی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں

---

[1] پندرہ روزہ صدائے اردو۔جلد۶۔شمارہ ۱۷۔۱۵/اپریل۔۲۰۰۷ء۔ص ۱۵

اردوادب میں یہ جو اتنا سارا اشاعتی کاروبار انجام پا رہا ہے تو اس سے ہونے والے فائدہ سے کون استفادہ کرتا ہے۔ ہم نے تو اردو ادیب اور شاعر کو جب بھی دیکھا اس حالت میں دیکھا کہ نہایت عجز وانکساری کے ساتھ اپنی کتابوں کے نسخوں کو اپنے احباب اور صاحبان اقتدار وثروت کے درمیان مفت تقسیم کرتا چلا جا رہا ہے۔ بھلے ہی دیگر زبانوں میں کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہوں لیکن یہاں تو ہاتھوں ہاتھ دی جاتی ہیں بلکہ ہم تو بعض کثیر التصانیف اردوشاعروں اور ادیبوں سے صرف اس لیے نہیں ملتے کہ کہیں وہ اپنی کتابوں کا بوجھ ہماری جھولی میں نہ ڈال دیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اردو ادیب اور شاعر اپنی عزت وآبروتک بیچ دیتے ہیں۔ضرورت پیش آئے تو اپنا ضمیر بھی بیچ دیتے ہیں لیکن اپنی کوئی کتاب نہیں بیچ سکتے۔''[۱]

نعیم کوثر نے ''صدائے اردو'' کو کبھی بلیک میلنگ کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ ہی شخصیات اور تخلیقات کو بے وجہ طنز کے تیروں سے مجروح کیا۔ان کی تنقیدی صلاحیت ہر جگہ ان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ زیادہ تر ''صدائے اردو'' کے لیے بہترین تخلیقات کا انتخاب کرتے رہے۔انہوں نے ایسے تخلیق کاروں کو بھی ''صدائے اردو'' کے اوراق پر جگہ دی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔نعیم کوثر خود افسانہ نگار ہیں اور انہوں نے ''صدائے اردو'' میں بھی افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع ہونے کا موقع دیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''صدائے اردو'' جیسے معیاری پرچہ میں انہوں نے عام قاری کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے فلمی خبریں اور فلمی شخصیات پر مبنی مضامین بھی شائع کئے۔

''صدائے اردو'' کی پالیسی ہمیشہ حق گوئی اور انصاف پسند کے ساتھ غیر متعصّبانہ رہی اور غیر

---

[۱] پندرہ روزہ صدائے اردو۔جلد ۶۔شمارہ ۱۷۔۱۵/اپریل ۲۰۰۷ء۔ص ۳

اردو داں طبقے کے اچھے لکھنے والوں کو انھوں نے ہمیشہ اپنے اخبار میں جگہ دی۔ مثلاً شرون کمار ورما کی کہانی ''کھوٹا سکّہ'' گیان پرکاش وویک کی کہانی ''آواز'' بھی ۱۵/اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی یہ محض ایک شمارے کی بات ہے یہ پالیسی تمام ہی شماروں پر کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔

اردو کی ادبی دنیا میں منعقد ہونے والے ادبی شخصیات کو دیئے جانے والے اعزازات استقبالیہ پروگرام، سیمینار، شعری ادبی محفلوں وغیرہ کی خبریں اور تصاویر بڑی اہمیت کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ اسی طرح اہم ادبی شخصیات کی علالت یا سانحہ، ارتسال کی خبریں اور تصاویر کو بھی ''صدائے اردو'' میں ذمہ داری کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔

اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ افسانہ نگار اقبال مجید کو مختلف اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا ان کے اعزاز میں محفلیں آراستہ ہوئیں۔ نعیم کوثر نے اس کی تفصیل کو ۱۵/اپریل ۲۰۰۷ء کو شمارے ۱۷ کے صفحہ اول پر خصوصی طور پر شائع کیا۔ ملاحظہ فرمایئے۔:

''اقبال مجید کا شاندار استقبال''

''مرکزی وزیر سیف الدین سوزؔ سے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ لیتے ہوئے اقبال مجید''

''ممتاز افسانہ نگار اقبال مجید کو کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے سرفراز کئے جانے پر محبان اردو کی جانب سے یہاں ایک تہنیتی تقریب ایوانِ ملا رموزی میں منعقد کی گئی۔ کھچا کھچ بھرے ہال میں تقریب کی صدارت پاکستان کے ماہر اقتصادیات زاہد حسین نے کی۔ پدم شری راجیش جوشی، ڈاکٹر نصرت بانو روحی، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر ارجمند بانو افشاںؔ، اقبال مسعود، دیوی سرن، مختار شمیم اور منوہر کیشو نے اقبال مجید کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا۔۔۔۔ جلسہ کے آغاز میں نعیم کوثر مدیر

''صدائے اردو'' نے اپنی جانب سے کیلاش سارنگ کے ہاتھوں زاہد حسین اور اقبال مجید کو گلدستے پیش کئے۔''[۱]

اسی طرح اردو زبان کی ادبی شخصیات کی وفات کی خبریں اور اردو کے اخبارات اور رسائل کی خبریں بھی کثرت سے شائع ہوتی تھیں۔

''صدائے اردو'' کے وقار کو قائم رکھنے اور قاری کی دلچسپی کے پیش نظر ''صدائے اردو'' میں اہم ادبی شخصیات کے لطیفے بھی شائع کئے جاتے تھے۔ ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء کے شمارے میں شامل لطیفے ''تاریخ پارے'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند ملاحظہ کیجئے۔

''بے بلایا مہمان''

''ڈاکٹر ذاکر حسین کو ایک شادی میں شریک ہونا تھا۔ اتفاق سے اس زمانے میں ہر طرف شادیوں کی دھوم تھی اور سجاوٹ کے اعتبار سے ہر جگہ ایک جیسی رونق دکھائی دیتی تھی، جس کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کی کار ایک ایسی محفل کے سامنے کھڑی کرادی گئی جہاں وہ مدعو ہی نہیں تھے۔ ہندوستان کے صدر کی اس اچانک آمد پر محفل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہاں کے لوگ اپنی خوش نصیبی پر ناز کرنے لگے۔ ادھر ذاکر صاحب کو گاڑی کی رہنمائی کرنے والے کی غلطی کا اندازہ ہوگیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس غلطی کو یہ کہہ کر بڑی نفاست سے نبھا دیا۔

لوگ تو بلائے سے بھی نہیں آتے، لیکن مجھے دیکھو کہ بے بلائے آپ لوگوں کے یہاں آ گیا ہوں۔

---

۱ پندرہ وہ صدائے اردو۔ جلد۔ ۶۔ شمارہ ۱۷۔ ۱۵/اپریل ۲۰۰۷ء۔ ص ۱

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر وہاں بیٹھے دولھا دلہن کو مبارکباد اور دعائیں دیں، اس کے بعد جہاں جانا تھا، چلے گئے۔''

میں نے کب کہا؟

''ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو اپنے گھوڑے شب دیز سے اس قدر پیار تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جو شخص شب دیز کے مرنے کی اطلاع دے گا اس کی گردن اڑا دی جائے گی، جب شب دیز مرگیا تو درباریوں کی سخت پریشانی ہوئی کہ بادشاہ کو اس کی خبر کس طرح دی جائے؟ بھلا اپنی گردن کٹوانے کے لیے کون تیار ہوسکتا ہے؟ آخر ایک شاعر نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ اس نے شب دیز کی موت پر ایک نظم لکھی۔ نظم کی خوبی یہ تھی کہ اس میں کہیں بھی کھلے لفظوں میں شب دیز کے مرنے کا ذکر نہیں تھا اس کے باوجود یہ ماتمی نظم تھی۔

شاعر نے شب دیز کے سامنے نظم پڑھنی شروع کی ہر شعر بادشاہ کی بے چینی میں اضافہ کرنے لگا۔

جب نظم ختم ہوئی تو بادشاہ چلا اٹھا: کیا شب دیز مرگیا؟''

میں نے کب کہا؟ یہ تو حضور کا ارشاد ہے۔'' شاعر نے جواب دیا اور اپنی جان بچالی۔[۱]

ملت کے مسائل اور دینی اور اسلامی نظریات پر مبنی مضامین کو بھی ''صدائے اردو'' میں جگہ دی جاتی رہی۔ ہندو مسلم تہواروں کے موقعوں پر بھی ''صدائے اردو'' میں ان سے متعلق تخلیقات بلاتفریق

---

[۱] پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد ۷ شمارہ ۱۔ ۱۵ ر اگست۔ ۲۰۰۸ء۔ ص ۱۲

شائع کی جاتی تھیں۔ مثلاً صابر ادیب کی نظم ''شب برات کی فضیلت'' کے عنوان سے شائع ہوئی جس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

شعبان میں ایک رات ہے وہ ہے شبِ براُت
تقسیم رزق، عمر کی اک احتسابی رات
جو شخص کاٹتا ہے عبادت میں ساری رات
اور روزہ رکھ کے دن کو نبھاتا ہے اپنی بات
اللہ نعمتوں سے نوازے اسے مدام.........!
جو مانگے رحمتوں سے کرے اس کو شادکام
اس رات کی نمازوں کا ہے اجر بے حساب
حمد و ثناء دعاؤں کا ہے اجر بے حساب[۱]

رہبر جونپوری نے اسلام کی تاریخ کے ایک اہم باب کو پیغام حق۔ ''منظوم تاریخ اسلام ختم نبوت تک'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ جسے نعیم کوثر نے پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' ۱۵/اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے میں شائع کیا۔ جس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

جھیل چکے تھے بدر کے میداں میں مشرک کچھ ایسی ہار
آتا کب تھا اُن کے دل کو اس صدمے سے چین قرار
کرتے رہتے تھے یثرب کے اسرائیلی شر ایجاد
دل ہی دل میں اہلِ حق سے جلتے رہتے تھے جلّاد
لیکن انکے ہر فتنے کو کرتے تھے حضرتؐ ناکام
روز و شب بڑھتا جاتا تھا یثرب میں زورِ اسلام

۱؎ پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد ۷۔ شمارہ۔۱، ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء۔ ص ۱۵

سہمے سہمے تھے یثرب کے سارے مشرک اور یہود
اپنی لاچاری کے غم میں کڑھتے رہتے تھے مردود
مکّہ میں اسلام کے دشمن تھے دل سے خود بوسفیان
کانٹا بن کر چبھتے تھے آنکھوں میں اہلِ ایمان
باطل کی سرداری کا تھا اب ان کے ہاتھوں میں جام
ان کا لوہا مان چکا تھا مکّے کا ہر خاص و عام
لیکر ساتھ لٹیرے دوسو پھر اک دن آئے سفیان
ابنِ مشکم کے گھر ٹھہرے تھا جو یثرب کا شیطان[۱]

''صدائے اردو'' نام کے مطابق اردو نواز پرچہ تھا۔ جس میں نعیم کوثر نہایت بے باکی کے ساتھ اردو کے مسائل اردو والوں کی اردو سے بے رخی حکومت کی اعلان کردہ اردو کے حق میں فائدے مند پالیسیز کو علمی طور پر جاری نا کئے جانے پر سخت وار کرتے تھے۔ ''صدائے اردو'' میں اردو کے مسائل اور ان کا حل پیش کرنے والے مصنفین کے مضامین بڑی تعداد میں شائع ہوتے تھے۔

''صدائے اردو'' کی اردو کے سلسلے میں حق گوئی اور اردو زبان اور ادب کی تدریس کی اہمیت پر نعیم کوثر بہت بے باک اور کبھی کبھی تلخ گو بھی ہو جاتے تھے۔ اردو زبان کے مسائل اور اس کے ساتھ کی جارہی ناانصافیوں پر نعیم کوثر خاموش نہیں رہتے انہوں نے اردو دشمن خبروں کو بے خوف ہو کر بے باکی کے ساتھ نڈر ہو کر شائع کیں۔ ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء کے شمارے میں خبر شائع ہوئی جس کی سرخی ہے:

''ڈاکٹر علیجاہ نے میگھالیہ میں اردو کا صور پھونکا''

''لاکھوں روپئے لٹا دیے احباب نوازی میں''

---

[۱] پندرہ روزہ۔ صدائے اردو۔ جلد ۶۔ شمارہ ۱۷۔ ۱۵/اپریل۔ ۲۰۰۷ء۔ ص ۲

قومی کونسل برائے فروغ اردو اور سکریٹری چندر بھان خیال پر لگائے گئے الزامات کو صدائے اردو میں نہایت بے باکی کے ساتھ شائع کیا۔

نعیم کوثر اردو زبان کی ترقی کے لیے اپنے پرچہ ''صدائے اردو'' کے ذریعہ ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے اردو کے فروغ کے لیے ادبی انجمنوں کی خبریں، ادبی مضامین اور شعری تخلیقات کو کثرت سے شائع کیا۔

مثلاً پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی ایک نظم کو انہوں نے اس موقع پر شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے ''اردو'' نظم ملاحظہ کیجئے:

ریاض دہر میں اردو وہ ایک خوش رنگ پودا ہے
جسے خون جگر سے ہندو مسلم نے سینچا ہے
مرے اہل وطن یہ آدمیت کا تقاضا ہے
محبت کا، حمیت کا شرافت کا تقاضا ہے
کہ ہم پامال جور آسماں ہونے نہ دیں اس کو
خزاں کے دور میں وقف خزاں ہونے نہ دیں اس کو
وطن بھی ایک ہے اپنا زباں بھی ایک ہو اپنی
چمن جب ایک ہے طرز بیاں بھی ایک ہو اپنی![1]

اسی طرح ''صدائے اردو'' میں ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اردو کلچر سینٹر میں دنیائے اردو کی باقیات کا تحفظ'' کے عنوان سے خبر شائع ہوئی ہے جس میں اردو کی نایاب اشیاء کی حفاظت کی بات کہی گئی ہے خبر کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

---

[1] پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد ۷۔ شمارہ ۱۔ ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء۔ ص۔ ۱۴

''حیدرآباد (پریس نوٹ) دنیا کی کوئی بھی زبان اس ملک وقوم کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی ورثے کا آئینہ ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اے ایم پٹھان، وائس چانسلر نے شہر حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے ممتاز ادباء، شعراء اور دانشوروں سے تبادلہ خیال کے دوران کیا جو یونیورسٹی کیمپس کے مشاہدے کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ پروفیسر پٹھان نے کہا کہ مولانا آزاد اردو یونیورسٹی میں قائم کئے جانے والے اردو کلچر سینٹر (اردو میوزیم) میں دنیائے اردو کی نادر و نایاب اشیاء کے خزینوں کو محفوظ کیا جائے گا۔''[۱]

نعیم کوثر کی صحافتی خدمات اور خاص طور سے پندرہ روزہ پرچہ ''صدائے اردو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون ''نعیم کوثر: لفظ شناس کے آئینہ میں'' رشید انجم لکھتے ہیں:

''نعیم کوثر کو میں شعلہ بدست صحافی کہتا ہوں چونکہ وہ ''صدائے اردو'' پندرہ روزہ کے مدیر ہیں۔ اس ادبی جریدے میں انہوں نے خود کو کئی حیثیتوں سے نمایاں کیا ہے اور متشکل بھی کیا ہے۔ وہ ایسے ''خوبرو مدیر'' ہیں جو اپنی خوبروئی پر ناز نہیں کرتا، دعوت دیتا ہے کہ آؤ قریب اور پرکھو مجھے کہ میں پہلے انسان ہوں پھر قلم کار۔ ''صدائے اردو'' سے انہوں نے اپنی صحافت کا جو معیار ابتداً قائم کیا وہ اس طرح سرفرازانہ قائم محو سفر ہے۔''[۲]

---

۱ پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد ۶، شمارہ ۱۷۔ ۱۵/ اپریل ۲۰۰۷ء ص ۱۶

۲ لفظ شناس۔ مرتب رشید انجم۔ ص ۱۱

ان سطور کی صداقت کے لیے صدائے اردو کی ان شماروں کے اداریوں کے یہاں مختصراً اقتباسات پیش ہیں ان اقتباسات سے نعیم کوثر کی صحافت کی حق گوئی اور بے باکی نمایاں ہوتی ہے جس میں نہ تو لاگ لپیٹ ہے نہ خودستائی اور نہ مالی منفعت کا معمولی سا جذبہ۔ وہ اخلاص پرورصحافت نمایاں ہوئی ہے جو ہر بدعنوانی کے خلاف ایماندارانہ قلم سے نکل کر کاغذ پر ابھرتی ہے انہوں نے کبھی زرد صحافت کو اپنی پالیسی میں داخل نہیں ہونے دیا۔ بدعنوانی خواہ زبان وعلم میں ہو، سماج میں ہو، سیاست میں ہو یا ملکی قانون میں، وہ ہمیشہ اس کے خلاف صف آرا ہوئے وہ ہمیشہ اس قول کے قائل رہے کہ تلوار اپنے مدمقابل کو ایک ہی بار میں سپردِ مرگ کر دیتی ہے جبکہ قلم نشتر کا فرض انجام دیتا ہے اور ایک ماہر جراح قلم سے نشتر کا کام لے کر جسم سے فاسد مادے کو خارج کر کے جسم کو پھر سے توانائی وتندرستی دیتا ہے۔ اردو کے تعلق سے کسی بھی غلط بات کو نعیم کوثر برداشت نہیں کر پاتے تھے اس لیے تکرار کا ایک طویل سلسلہ گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے درمیان ''صدائے اردو'' کے صفحات پر موجود ہے۔

بدنام زمانہ کتاب ''ایک بھاشا دولکھاوٹ دوادب'' جب منظر عام پر آئی تو اردو برادری میں ہر جانب شورغوغہ بلند ہوا۔ اس کے مصنف پروفیسر گیان چند جین تھے۔ جو عرصہ دراز تک بھوپال میں استاد کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں اردوعلم وادب کی کئی ہستیاں آج بھی موجود ہیں۔ بھوپال نے انہیں عزت واحترام دیا۔ وہ اردو کے نہ صرف پروفیسر تھے بلکہ اس زبان کے کئی موضوعات پر ان کی کتابیں طبع ہو چکی تھیں۔ اور یہ کتاب نہ صرف متنازعہ بنی بلکہ غیرمسلم ادیب کے متعصّبانہ ذہن کی عکاس بھی ثابت ہوئی۔

اردوصحافیوں میں سب سے قبل نعیم کوثر نے صدائے احتجاج بلند کی اور ''صدائے اردو'' میں اس

کتاب کی اشاعت کے خلاف نا صرف کھل کر لکھا بلکہ اہل دانش و پاسبانِ علم و ادب کی جانبدارانہ پالیسی پر بھی ضرب لگائی گیان چند جین کی اردو کے مخالف متعصّبانہ زہرافشانی کے خلاف محاذ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس مسئلے پر نعیم کوثر نے صدائے اردو میں اداریہ لکھا جس کی ابتداء اس شعر سے کی:

''جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
جب بولنے لگے تو ہمیں پر برس پڑے''

''ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب ایک بدنما داغ۔ وطن تو متروک ہوا، زبان بھی مردود ہوئی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ابنائے وطن کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کریں'

اس عنوان کے بعد نعیم کوثر نے جو اداریہ تحریر کیا اس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

> ''ڈاکٹر گیان چند جین کی متنازعہ کتاب ''ایک بھاشا دولکھاوٹ دو ادب''، کسی علمی، تحقیقی، سیاسی و مجلسی نظرئے کی اساس نہیں کہی جاسکتی۔ بلکہ یہ پیرانہ سالی میں پروپیگنڈانہ قلم فرسائی ہے یہ حقیقت ہے کہ اردو علم و ادب نے علمی و تحقیقی خدمات کو ہمیشہ سراہا ہے اور انہیں اعلیٰ باوقار مناصب عطا کئے ہیں لیکن افسوس اس سرزمین کی سرحدیں پھاندوہ مہاجر فی سبیل اللہ ہو گئے اور ان کے قلم سے بے وفائی کی جفا کاری ابل پڑی، سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر جین کی فکر میں سوقیانہ ولولہ اور فتنہ کیوں کر مچل اٹھا اور انہوں نے اردو کو بے وقار اور آبرو باختہ کیوں کہا؟۔۔۔۔۔
>
> ۔۔۔۔ادارہ ''صدائے اردو' نے یہ کتاب پڑھی تو نتیجہ اخذاً کہا کہ ڈاکٹر

جین کی روایتیں اور دلائل نہ قرین عقل ہیں اور نہ مطابق منطق ۔ ایک ایک قول اور فعل چیستاں ہے منافقانہ اور گمراہ کن ہے ۔ ہم اردو کے ممتاز دانشور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے توقع کرتے ہیں کہ وہ آگے آئیں اور علم و ادب کو ڈاکٹر جین کی زہرافشانی سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا شکار ہونے سے بچائیں گے کہ اردو نے ملک کی آزادی ۔ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے لیے عظیم قربانیاں دی ہیں ۔ اردو زندہ تھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی لیکن کئی نسلیں ان خرافات کے خلاف ڈاکٹر جین کی روح کو بے چین کرتی رہیں گی ۔
ہم اردو سماج سے اپیل کرتے ہیں کہ اس کتاب کا مکمل بائیکاٹ کریں ''[۱]

اس ادارئے کی مجتہدانہ فکر و بصیرت اور شائستگی کے ساتھ مصنفِ کتاب کی معصیت آلودہ نقاب کو اتار پھیکا ۔ اس ادارئے کی اشاعت کے ساتھ ملک کے طول و عرض سے ادارئے شائع ہوئے اور کتاب کی مخالفت میں ''صدائے اردو'' کو ملنے والے خطوط کا سلسلہ قائم کیا یہ نعیم کوثر ہی تھے جنہوں نے نہ صرف اس کتاب کے مصنف کی مخالفت کی ۔ بلکہ یکم مئی ۲۰۰۶ء کے شمارہ ۱۸ پر ان دانشوروں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں حصہ لیا تھا ۔ نعیم کوثر لکھتے ہیں :

''ترقی پسند تحریک کے پر شباب عہد میں شہرت اور نام و نمود سے شکم سیر ہونے والے نقاد اور شارڈاکٹر کمال احمد صدیقی افسانہ اور ڈرامہ نگار ڈاکٹر محمد حسن کے اس بہروپیائی سوانگ پر اردو سماج انگشت بدنداں ہے جس کی آڑ میں انہوں نے ڈاکٹر جین کی کتاب کے دیباچے لکھ دئے اور اس طرح پیرانہ سالی میں اپنی قبریں بدل ڈالیں ۔

---

[۱] اداریہ صدائے اردو ۔ شمارہ ۱۷ ۔ ۱۵/ اپریل ۲۰۰۶ء

اس سلسلے میں مدیر صدائے اردو نعیم کوثر نے ایک کھلا خط دونوں دانشوران کو تحریر کیا ہے جس کی کاپیاں ہندو پاک کے کئی رسائل اور ادیبوں کو بھیجی گئی ہیں ہمیں امید ہے کہ کمال اور حسن دیانتداری سے اپنی پوزیشن صاف کریں گے اور اہلِ وطن کو بتائیں گے کہ بغیر کتاب پڑھے کیوں کر اور کس کے اشارے پر ابنائے وطن کے درمیان منافرت کا بیج بونے میں ڈاکٹر جین کی معاونت کی اور عمر کے آخری پڑاؤ میں ترقی پسندی اور حقیقت بیانی کی شفاف وراثت کو اپنے ضمیر اور علمی کمال پر مصلحت کی نقاب ڈال کر داغدار بنایا ہے۔''[1]

نعیم کوثر کی غیر جانبدار تحریروں اور اداریوں نے دانشوروں کو اس کتاب پر اظہار خیال کرنے پر مجبور کر دیا اور کافی عرصہ گیان چند جین کی کتاب ''صدائے اردو'' کے علاوہ ملک سے نکلنے والے اخبارات اور جرائدوں کا نہ صرف موضوعِ بحث رہی بلکہ ہر ذی ہوش قلمکار نے اس کی مخالفت کی۔ یہ موضوع ''صدائے اردو'' کا ایک مستقل اداریہ بن گیا تھا اور نعیم کوثر نے اپنی آگے کی اشاعتوں میں اس موضوع پر مختلف عنوانات سے مزمت اور مزاحمت کا سلسلہ قائم رکھا۔ ان تحریروں کی سرخیاں ملاحظہ کیجئے:

''ڈاکٹر گیان چند جین کو ذہنی حزام'' (صدائے اردو۔ شمارہ ۱۷۔ ۱۵۔ اپریل ۲۰۰۶ء)

''ڈاکٹر گیان چند جین ''صدائے اردو'' کی جرأت انگیزی نے اردو سماج کو بیدار کیا۔ اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور محمد حسن کو جواب دینا ہوگا''۔ (صدائے اردو۔ شمارہ ۱۸۔ یکم مئی ۲۰۰۶ء)

''کھلا خط بنام ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن جنہوں نے پیرانہ سالی میں قبلہ بدل لیا''۔ (شمارہ ۱۹۔ ۱۵ مئی ۲۰۰۶ء)

''قبرستانی اردو۔ ہندی اور گیان چند جین'' (شمارہ ۲۰، یکم جون ۲۰۰۶ء)

---

[1] صدائے اردو۔ شمارہ ۱۸۔ یکم مئی ۲۰۰۶ء

''ڈاکٹر گیان چند جین۔ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور پروفیسر محمد حسن۔جنتا کی عدالت میں''۔(شمارہ ۲۱۔یکم جولائی ۲۰۰۶ء)

''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو کے فرہاد صفت کوہکن اور قیس مثال صحرا گرد ہیں۔حالات کا تقاضہ ہے کہ وہ خاموشی توڑیں''۔(شمارہ ۲۲۔۱۵/جولائی ۲۰۰۶ء)
ڈاکٹر محمد حسن کا جواب بنام نعیم کوثر''۔(شمارہ ۲۲۔۱۵/جولائی ۲۰۰۶ء)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ گیان چند جین کی متنازعہ کتاب پر لکھا گیا نعیم کوثر کا پہلا اداریہ اردو سماج کو بیدار کرنے کا باعث بنا اور اس نے ملک گیر مخالفانہ صورت اختیار کر لی لیکن گیان چند جین اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہی شدید بیمار ہو کر امریکہ میں زیرِ علاج تھے اور کچھ مہینے موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئے۔اس کے بعد یہ مخالف سلسلۂ تحریر تو تقریباً موقوف ہو گیا لیکن نعیم کوثر نے اردو ہمدردان اور جاں نثاران کو جس متنازع مسئلہ کی جانب توجہ دلائی تھی آج بھی اس کی مثال اردو سماج میں دی جاتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی میں جب ڈاکٹر علی جاوید کا بطور ڈائریکٹر تقرر عمل میں آیا اور ان کے غیر انتظامی کارنامے جو اردو کے فروغ، ارتقاء اور اس کی بقاء میں نفرت رساں بن کر منظرِ عام پر آئے نعیم کوثر نے ان کارناموں کی مصدقہ نقول حاصل کر لیں تو ڈاکٹر علی جاوید کے خلاف ''صدائے اردو'' کے صفحہ اول پر تحریری محاذ قائم ہو گیا۔نعیم کوثر نے تصدیق کے ساتھ ڈاکٹر علی جاوید کی اردو مخالف سرگرمیوں اور قومی کونسل کے سرفراز عہدے کا بیجا استعمال اور زیادہ سے زیادہ ذاتی منفعت حاصل کرنے کی بدعنوان کردار پرستی کو اُجاگر کیا۔وہ بنارُ کے بنا ٹھہرے مسلسل لکھتے رہے۔کوئی سیاسی دباؤ ان کی اشتعال انگیزی کو فرد نہیں کر سکا۔انہوں نے ''صدائے اردو'' تک ہی اس مخالفت کو محدود نہیں رکھا بلکہ مرکزی حکومت اور قومی کونسل کے سربراہ ارجن سنگھ کو بھی میمورنڈم پیش کر کے علی

جاوید کی بدعنوانیات کے دستاویزی ثبوت فراہم کئے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک سرگرم رہا جب تک کہ ڈاکٹر علی جاوید کو ڈائریکٹر شپ سے رخصت نہ کر دیا گیا۔

''صدائے اردو'' میں جو ادارئے اور مضامین ڈاکٹر علی جاوید کی بدعنوانیات کے خلاف شائع ہوئے یہاں صرف ان مضامین کی سرخیوں پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے:

''زٹلّی کے پرستار میں ہمت ہو تو جواب دیں۔ فرخ سیر کے آگے نہیں آئیں اور قواعد کے آگے سر جھکائیں۔ واہ ڈاکٹر عالی جاہ جواب نہیں، لگے رہو'' (صدائے اردو شمارہ ۱۳۔ ۱۵ فروری ۲۰۰۸ء)

''قومی کونسل برائے فروخت'' اردو زبان۔ انتظامی تنزل اور بحران میں'' (''صدائے اردو'' شمارہ ۱۲۔ یکم فروری ۲۰۰۸ء)

''فروغ اردو کونسل۔ ہونے لگے ''زٹلی وار'' (شمارہ ۱۱۔ ۱۵/جنوری ۲۰۰۸ء)

''ڈاکٹر علی جاوید کی فرض فراموشی! تخلیقی بانجھ پن کے شکار اور مرد بیمار ہیں۔'' (شمارہ ۱۰۔ یکم جنوری ۲۰۰۸ء)

''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شرمناک رویہ۔ بیگم ابومحمد سحر کو تجارتی ناشر قرار دیا۔'' (شمارہ ۸ اور ۹۔ ۱۵/دسمبر ۲۰۰۹ء)

''گھر کے صوفی گھر کے قوال'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ دبنگ ادیبوں کے وارے نیارے''۔ (''صدائے اردو'' شمارہ ۱۳۔ ۱۵/فروری ۲۰۰۹)

اس عنوان کے تحت ان کتابوں کے نام، ان کی اشاعتی تعداد اور ان پر صرف ہوئے جملہ مصارف کی تفصیل دی گئی تھی جو ڈاکٹر علی جاوید کی ڈائریکٹر شپ میں فراخدلی سے شائع کی گئیں۔ صرف ۱۳/کتابوں کی جملہ ۱۸۰۵۰ تھی اور ان پر ۱۷۸۶۸۲۶ روپئے کی لاگت آئی تھی۔ ان کے علاوہ

جو کتابیں ہزاروں کی تعداد میں ۲۰۰۶ء۔ ۲۰۰۵ اور ۲۰۰۷۔ ۲۰۰۶ء میں چھاپی گئیں ان کے جملہ پچیاسی لاکھ مصارف کی تفصیل مصدقہ شائع کی گئی تھی ان کتابوں کی فروختگی نہ ہونے کے برابر رہی مگر ان کی رایلٹی تخلیق کاروں کو ادا کی گئی لیکن کتابوں کی عدم فروختگی کی وجہ سے قومی کونسل پر جو بار آیا اس کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر علی جاوید کی نااہلیت کو اجاگر کرگئی۔ نعیم کوثر نے یہیں تک بس نہیں کیا۔ ڈاکٹر علی جاوید کی ذات کو جس طرح اردو تقاریب کے انعقاد سے جو فوائد حاصل ہوئے ان کی تصدیق شدہ رپورٹیں بھی شائع کیں۔ آخرکار پیمانہ لبریز ہوا۔ اور علی جاوید کو قومی کونسل کی بادشاہت سے رختِ سفر باندھنا پڑا۔ یہ نعیم کوثر کا وہ بیباک بےخوف اور نڈر صحافتی کارنامہ تھا جس کی مثال پوری اردو برادری اور اردو صحافت نہیں دے سکی۔

نعیم کوثر نے ''صدائے اردو'' کو بہت جانفشانی سے جاری رکھا۔ اس میں ادبی، سماجی، معاشرتی، تاریخی، تحقیقی اور تخلیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان کی صحافت قدآوری اور سوجھ بوجھ کی غماز رہی۔ ''صدائے اردو'' نے نعیم کوثر کی ادارت میں تقریباً ۱۵ سال تک لگاتار بھوپال کے تعلق سے اردو صحافت کا نام روشن کیا۔ بھوپال کی ادبی زمین سے اشاعت پذیر یہ پہلا ادبی اخبار ہے جو ۲۰۰۱ء ہے۔ ۲۰۱۷ء تک مسلسل شائع کیا جاتا رہا۔ ۲۰۱۰ء میں جب کمپوزنگ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں اور پندرہ روزہ کے مقررہ معیار کی اشاعت میں دشواریاں آئیں تو باہم مشورہ سے ''صدائے اردو'' کو ماہنامہ کر دیا گیا۔

۲۰۱۰ء سے مئی ۲۰۱۱ء تک اس کی ماہانہ اشاعت ہوئی۔ انڈین پوسٹ نے جب ڈاک خرچ میں اضافہ کیا اور پابندیاں عائد کیں تو نعیم کوثر اسے مزید جاری نہ رکھنے پر مجبور ہو گئے لیکن ان کی دلی خواہش رہی کہ یہ اخبار بند نہ ہو سہ ماہی کاروانِ ادب بھوپال اور ہندی روزنامہ بھوپال ہلچل کے مدیر

جاوید یزدانی کو نعیم کوثر نے بالآخر ''صدائے اردو'' کے مالکانہ حقوق پریس قانون کے مطابق منتقل کردیئے۔ نعیم کوثر کو بانی مدیر کی حیثیت سے برقرار رکھا گیا۔ اقبال مسعود مدیر، جاوید یزدانی مدیر اعلیٰ خصوصی مدیران پروفیسر قاسم نیازی اور رشید انجم مقرر ہوئے۔ اس پورے نئے سیٹ اپ کے بعد یکم جولائی ۲۰۱۱ء کو ''صدائے اردو'' کا پہلا شمارہ اسی طمطراق سے منظر عام پر آ گیا جس کا انتظار نہ صرف بھوپال کے اردو ادب کے پرستاروں کو رہتا ہے بلکہ ملک کے اہم شہروں اور بیرونِ ملک کے اردو کی نوآبادیات کے ادیبوں، شاعروں اور تخلیق کاروں کو بھی منتظر رکھتا ہے۔

''صدائے اردو'' میں نعیم کوثر کا جو اداریہ یکم جون و یکم جولائی ۲۰۱۱ء کو شائع ہوا اس میں انہوں نے ''صدائے اردو'' کے مالکانہ حقوق جاوید یزدانی کو دینے کا ذکر واضح طور پر کیا ہے۔ ساتھ ہی یکم جون و یکم جولائی ۲۰۱۱ء کے شمارہ ۱۱ اور ۱۲ کی مشترکہ اشاعت میں نعیم کوثر کا جو الوداعی اداریہ شائع ہوا وہ ان کی دس سالہ صحافتی زندگی، جدوجہد اور کاوش حیات کی لہو رنگ تحریر ہے۔ اس اداریے نے نہ صرف ان کے دلی جذبات کا اظہار بلکہ ان کے تخلیقی شعور، ان کے عمر بھر کے تجربے، ہر ادوار کے تجزئے اردو علم وادب اور اردو صحافت کی دشوار گزار، سنگین اردو صحرائی شوریدہ سری اس مسافرت کا اظہار بھی ہے جو پاؤں کے چھالوں کا زخم سہہ کر بھی اجالوں کی افق پر نگاہ رکھتی ہے۔ وہ الوداعی اداریہ ان صفحات پر اس لیے پیش ہے کہ نعیم کوثر کی صحافت اور اس صحافت سے ان کی اردو زبان، اردو علم اور اردو ادب کی محبت اور اس کی سرفرازی کی دعائیہ خواہش کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

''شکوہ ظلمتِ شب۔ الداعیہ''

''میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے بھی
کہ یہ سچ پختہ سیاہی سے صفحۂ قرطاس پر درج ہے اور ادبی تاریخ کا ایک

جز بنتی جا رہی ہے۔ آج سے ایک عشرہ قبل جب صدائے اردو کا اجراء کیا تھا تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ شخص، گوشوں، مبالغہ آمیز تعریفوں کی آکسیجن سے اخبار مذکورہ کو زندہ رکھنے کی کوشش سے گریز کیا جائے کہ پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اور بھی ذرائع دیئے ہیں، اس کا مقصد شہرت اور دولت کا حصول بھی نہ تھا کہ وہ شہرت تو پل بھر کا تماشا ہے اور لکشمی سدا کسی کے گھر میں نہیں بیٹھتی۔

''صدائے اردو'' نکالنے کا مقصد تھا کہ کلاسیکی ادب کونسل نو سے روشناس کرایا جائے ان کو اپنی وراثت سے آگاہ کیا جائے۔ تخلیقی ادب اور تحریر کا شوق پیدا کیا جائے کہ ''صدائے اردو'' کے صفحات ان کے لیے موجود تھے کہ نئے رسائل یا اخبارات نئے لکھنے والوں کی نہ ہمت افزائی کرتے ہیں نہ حوصلہ دیتے ہیں۔ آخر نئے پڑھنے والے لکھنے والے نہ ملیں گے تو اردو زندہ کیسے رہے گی۔ مگر افسوس کہ اردو والوں کی بے التفاتی اور سماج کی بے حسی نے خواب کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔

صدائے اردو نے اپنی دس سالہ سرگرمیوں کے دوران مثبت اختلاف رائے کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے۔ کہ مکالمہ بہتری کی صورت حال پیدا کرتا ہے چنانچہ گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے تنازعہ میں ہم نے مثبت رول ادا کیا اور کوشش کی کہ اردو کے ان عظیم دانشوروں کو یکجا کرنے اور اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر اردو کی ترقی و بقاء کے لیے

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد کرائی جائے مگر صد افسوس کہ فاروقی صاحب نے کہا کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو جبکہ نارنگ صاحب نے تحریر فرمایا کہ اردو کی بقاء کے لیے وہ گلے گلے ہمارے ساتھ ہیں۔ کشمیری لال ذاکر نے بھی مشورہ دیا کہ ان لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں۔ جب کہ فضیل جعفری، ڈاکٹر مظفر حنفی، خالد محمود اور دیگر مشاہیر ادب نے میری کوشش کو سراہا۔

صدائے اردو نے دس سالوں کے دوران کبھی بھی زرد صحافت کا سہارا نہیں لیا۔ زبان و ادب کی شائستگی کو ہمیشہ اپنا شعار بنایا چنانچہ ڈاکٹر علی جاوید جو اپنی شب بسری کے لیے بلانوشی کا سہارا لیتے تھے انہوں نے فروغ اردو کونسل جیسے قومی ادارے کو اپنی آمرانہ پالیسیوں سے نقصان پہنچایا، اس کی ساکھ کو دھکا دیا ان کے خلاف ہم کامیاب ہوئے، اس وقت کے وزیر تعلیم ارجن سنگھ کو دہلی جا کر تحریری میمورنڈم دیئے، اور زٹلی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گمنامی کے پردے میں چلے گئے مگر ان کا نام جو ہم نے جعفر زٹلی رکھا تھا اب ان کی پہچان بن گیا۔

ہم نے ریاستی سطح پر اردو زبان کے کئی مسائل اٹھائے اور مقامی انجمنوں اور مشاہیر زبان و ادب سے ایک پلیٹ فارم پر آنے اور جد و جہد کرنے کا مطالبہ کیا۔ اردو ٹیچرس کے خالی عہدے بھرے جانے کا مسئلہ اہم ترین تھا۔ لیکن افسوس کہ صوبہ خصوصاً راجدھانی کی خود ساختہ قد آور مشاہیر

نے کوئی توجہ نہیں کی۔ ان کی سرد مہری اور بے حسی نے میری ہمت پست کردی۔

''صدائے اردو'' آج دس سال گزرنے کے بعد ان کو سونپ رہا ہوں جن کے ہاتھوں میں پھول سرسبز وشاداب رہتے ہیں۔ جاوید یزدانی برق دم صحافی اور مجاہد اردو ہیں۔ دس سال سے ''کاروانِ ادب'' کو کامیابی سے نکال رہے ہیں۔ وہ مسائل سے نبرد آزما ہونا جانتے ہیں کہ تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیئے۔

آخر میں عرض ہے کہ میرا دس سالہ صحافتی سفر کا تجربہ بقول شاعر۔

ذائقہ کون بتائے اس کا
وقت ہیرے کی کنی ہو جیسے

(نعیم کوثر)''[1]

''صدائے اردو'' میں نعیم کوثر کا جو آخری اداریہ اکتوبر نومبر ۲۰۱۷ء کو شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''بس ہو چکی نماز مصلاّ اٹھایئے۔۔۔۔ لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم''

''صدائے اردو'' ۱۵/ سال کا خونِ جگر سے پالا پوسا۔ پھر بھی ہمہ وقت سسکیاں، مایوسی، غم، اضمحلال، پرانے نئے نغمے سنائے۔ نہر پہ چل رہی ہے پن چکّی۔ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ آوازیں آتی رہیں۔ اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر۔ تاریکی کا شکوہ کیا کریں۔ اپنے حصّے کا چراغ جلاتے رہے۔ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں۔ ہم مجبوروں کی مے خواری

---

[1] صدائے اردو۔ شمارہ ۱۱۔۱۲۔ یکم جون۔ جولائی۔ ۲۰۱۱ء

مانگے کی مے خواری رہی۔ قاری کا دل نہ پسیجا۔ حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی۔ سایہ تک بھاگ گیا۔ چھوڑ کے تنہا ہم کو۔ سسکیاں بھرتا ہوا۔ میں نقش تھا مٹا دیا، چراغ تھا بجھا دیا۔ آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک۔

فروغِ اردو کونسل میں جب محترم شمس الرحمٰن فاروقی اور جناب چندر بھان خیال جیسے اردو شیدائی سربراہ ہوئے تو اردو رسائل پر فصل بہار آ گئی۔ سو پرچوں کی خریداری منظور ہوئی۔ ''صدائے اردو'' کے ہاتھ چنبیلی سے مہک اٹھے۔ ڈاکٹر علی جاوید اور ارتضٰی کریم کی آمد۔ ''آئے تو انہوں نے صدائے اردو کی رگ جاں پر چنگیزی حملہ کیا۔ ہزاروں روپئے کے بل آج تک ادا نہیں کیے۔ ایک بھی خط کا جواب نہیں دیا۔

میری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا
بڑے خطرے میں ہے حسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے

ڈاکٹر گیان چند جین کی ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ۔۔۔۔'' کے لیے ''صدائے اردو'' ایک برقِ تجلی بن گیا تھا۔ مرحوم عبدالقوی دسنوی نے سمجھایا۔ سانڈوں کی لڑائی میں موم بتیاں استعمال نہیں کرتے۔ راقم الحروف کی پینشن بک پرٹڈی دل۔ سینہ پر ضیق النفس کا کولہو۔ جو ہوا سو ہوا۔ منظور تھی شکستگئی زباں کی۔ تھوڑی سی شراب ناب پیلی۔ قارئین کو الوداع۔

جب کبھی گور غریباں پر چراغاں کرنا
ایک ٹوٹی تربت پہ بھی احسان کرنا

اب اس یادگار کی کمان جناب جاوید یزدانی کے ہاتھوں میں
رہے گی۔ راقم الحروف چند اختیارات کرتا رہے گا۔‘‘[۱]

گویا جولائی ۲۰۱۱ء سے صدائے اردو جاوید یزدانی نے سنبھالا اس سلسلے میں راقم الحروف نے اور میری نگراں پروفیسر ارجمند بانو نے تمام متعلقہ حضرات سے معلومات حاصل کرنی چاہی لیکن کسی نے بھی کوئی حتمی معلومات نہیں دی۔ جاوید یزدانی مسلسل بیمار چل رہے ہیں اور پونا میں زیر علاج ہیں انہوں نے سیل فون پر بتایا کہ کم و بیش ڈیڑھ سال میں صدائے اردو کا مالک اور مدیر اعلیٰ رہا۔ میرے ساتھ اقبال مسعود بھی مجلس ادارت میں شامل تھے۔ اقبال مسعود، نعیم کوثر اور صدائے اردو کے کاتب نعیم انصاری سے بھی کوئی واضح معلومات نہیں مل سکی۔

بہر حال ڈیڑھ سال بعد نعیم کوثر نے دوبارہ ’’صدائے اردو‘‘ واپس لے لیا اس کے بعد اکتوبر نومبر ۲۰۱۷ء میں صدائے اردو کے اداریہ سے جو نعیم کوثر نے لکھا ہے۔ اس میں صدائے اردو کے مالکانہ حق اور ادارت نعیم کوثر نے واپس جاوید یزدانی کو دے دیئے۔ اور اس کے بعد ’’صدائے اردو‘‘ کا مہکتا گلشن ہمیشہ کے لیے سُکھا دیا گیا۔

[۱] ’’صدائے اردو‘‘ جلد۔۱۶۔شمارہ ۲،۳۔اکتوبر نومبر ۲۰۱۷ء

نعیم کوثر بحیثیت ناقد

تنقید کی تعریف:

تنقید عربی زبان کا لفظ ہے جو ''نقد'' سے بنا ہے۔ اس فن پر عربی میں ''علامہ مرزبانی'' کی کتاب ''الموشع'' کے نام سے ہے جو فی الوقت عربی میں تنقید کی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں قدیم شعراء کے کلام پر لفظی ومعنوی عیوب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قدامہ ابن جعفر کی ''نقد الشعر'' اور ''نقد النثر'' جیسی کتابیں بھی تنقید میں بہت مشہور ہیں۔ تنقید کے اصول عربی سے فارسی میں اور پھر فارسی سے اردو میں آئے۔ اردو میں اس کے معنی جانچنا پرکھنا، کھرے کھوٹے، بھلے برے میں فرق کرنے کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً کسی فن پارے کو سمجھنا، اس کے معنی ومطالب کو واضح کرنا، بھلے اور برے کی وضاحت کرنا اور اس پر کسی نظریے کے تحت رائے دینا ادبی تنقید کہلاتی ہے۔

انگریزی میں تنقید کو Criticism کہا جاتا ہے اور یہ یونانی لفظ Kriticos سے بنا ہے جس کے معنی ''جاننا اور فیصلہ صادر کرنا'' ہے اور تنقید کرنے والے کو Critic یا نقاد کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال پہلی بار انگریزی میں ڈرائیڈن کی کتاب "The State of Innocence" میں ملتا ہے۔ اس کے بعد کئی یونانی اور دیگر نقادوں نے تنقید کا عمل اختیار کیا اور اپنے اپنے انداز سے اس لفظ کی وضاحت کی اور کسی نے اس کو فیصلہ صادر کرنا بتایا ہے اور کسی نے کھوج بین کرنا جیسا کام ٹھہرایا۔ مختلف ناقدین نے تنقید کی وضاحت اپنے طور پر کی ہے، ان میں سے چند کی کی گئی تعریف درج ذیل ہے:

رینی ویلیک کی رائے ہے:

"Literary Criticism in the most widely accepted sense is Judgement of books, reviewing and finally the definition of taste, of the tradition, of what is classic"

(Rene Welking from Internet)

اسپنگارن نے جداگانہ انداز میں تنقید کو تین چیزوں کی کھوج بتایا ہے کہ ایک ادیب یا شاعر نے کیا بتانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بتانے میں کتنا کامیاب ہوا ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے۔

"The Sole of Criticism is to answer three question, what has the artist tried to express? How he succeded in expressing it? Was it worth expressing?" (Spingsan)

(History & Principles of Literary Criticism P-2 Dr. Raghukul Tilak)

تنقید کی تعریف کرتے ہوئے ٹی ایس ایلیٹ لکھتے ہیں:

"Criticism is the commentation and exposing of works of art by means of written words.

(T.S Elliot-From-Internet)

مختلف ادیبوں اور نقادوں نے الگ الگ انداز میں تنقید کی تعریف مختلف کی ہے۔ اور اردو کے ناقدین نے جو تنقید کی تعریف کی ہے اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ عبادت بریلوی اپنی کتاب ''اردو تنقید کا ارتقاء'' میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''تنقید کی تعریف میں بہت اختلافات ہیں، مختلف لکھنے والوں نے تنقید کی تعریف مختلف کی ہے کوئی اس کو ادبیات کے پرکھنے اور جانچنے کا آلہ

بتا تا ہے کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ تخلیقی ادب پیش کرنے والوں پر لعن طعن کرتی ہے اور ان کو برا بھلا کہنے کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں، کسی کا خیال ہے کہ وہ صرف فنی تخلیقات کی اچھائیاں گناتی ہے، اور ان کی خوبیوں کو اجاگر کر کے پیش کرتی ہے تا کہ پڑھنے والوں پر ان کے گہرے اثرات اور دیر پا ہوں، کوئی کہتا ہے کہ نہیں وہ صرف تخلیقی ادب کی تشریح کرتی ہے، یعنی آسان انداز بیان اور آسان طرز ادا میں ان خیالات کو تفصیل کے ساتھ پھیلا کر بیان کرتی ہے جو فنی تخلیقات میں سموئے ہوئے ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر کہ تخلیقی ادب میں جو فلسفیانہ خیال چھپے ہوئے ہیں۔ فن کا جو نقطۂ نظر ہوتا ہے جو پیغام وہ عوام کو دینا چاہتا ہے، ان سب کا پتہ لگانا اور تجزیہ کرنا تنقید ہے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔''[۱]

تنقیدی شعور ہر انسان میں پیدائشی ہوتا ہے۔ وہ جب سے ہوش سنبھالتا ہے اچھے اور برے کی پہچان کرنے لگتا ہے۔ سید عبداللہ اپنی کتاب ''اشارات تنقید'' میں تنقید کا مطلب بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''محدود معنوں میں تنقید کا مطلب کسی ادب پارے کی خوبیوں اور کمزوریوں کا مطالعہ ہے۔ وسیع معنوں میں، اس میں تنقید کے اصول قائم کرنا اور ان اصولوں کو تنقید میں استعمال کرنا بھی شامل ہے۔ گویا اس میں کچھ نہ کچھ فلسفہ بھی داخل ہو جاتا ہے، کیوں کہ اصول بندی فلسفیانہ عمل ہے۔''[۲]

---

[۱] اردو تنقید کا ارتقاء۔ از عبادت بریلوی۔ ص ۲۹

[۲] اشاراتِ تنقید۔ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ص ۱۴

اردو میں جدید تنقید مغربی ادب سے آئی۔ جدید اردو تنقید کی باقاعدہ کتاب حالی کی کتاب ''مقدمۂ شعروشاعری'' ہے اور حالی کو جدید اردو تنقید کا بانی مانا جاتا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس سے پہلے اردو میں تنقید موجود نہیں تھی۔اس سے پہلے تذکروں کو قدیم تنقید کا نقش اول مانا جاتا ہے۔

جدید اردو تنقید میں حالی کا مقام نمایاں اہمیت کا حامل ہے اس کی خاص وجہ ان کی تحریر کردہ مذکورہ بالا تنقیدی کتاب ''مقدمۂ شعروشاعری'' ہے۔مختلف موضوعات پر ان کے وہ تنقیدی مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بعد میں ان تمام مضامین کو یکجا کر کے ''انجمن ترقی اردو'' نے انہیں ''مقالاتِ حالی'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ انکی سوانحی کتب ''حیات جاوید''''حیات سعدی''اور''یادگار غالب'' میں بھی ان کے تنقیدی نظریات ملتے ہیں۔

ملک میں آزادی کے بعد اعلیٰ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تنقید کا بھی آغاز ہوا۔اس کے تحت ادب پاروں کی گہری نظر سے جانچ کی جانے لگی۔تنقید نے لوگوں کے علم و ادب کے علاوہ سماجی اوراخلاقی شعور میں بھی اضافہ کیا۔

آزادی کے بعد نئی تعلیم کے تحت کالجوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں اس میں بھوپال کے تعلیمی نظام میں بھی زبردست تبدیلی ہوئی بھوپال میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے آغاز کے لئے اردو تحقیق وتنقید پر خاصی توجہ دی گئی۔

بھوپال کے ناقدین کو ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے اپنی کتاب ''بھوپال میں اردو انضمام کے بعد'' میں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''بھوپال کے ناقدین کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

(۱) وہ ادیب جنہوں نے محض نجی ذوق وشوق کی خاطر تنقیدی کام انجام دیے۔

(۲) ایسے ناقدین جنہوں نے حصول سند کی خاطر یا درسی ضروریات کے تحت تنقیدی مضامین، مقالات یا کتابیں تحریر کی ہیں۔

یہاں جو تنقیدی تصانیف شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہیں ان میں بیشتر ایم اے، یا پی ایچ ڈی کے لیے تحریر کردہ تحقیقی مقالات ہیں کچھ خالص تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ کچھ تنقیدی کتابیں موضوعاتی ہیں اور کچھ مطبوعات شخصیات سے متعلق ہیں''[۱]

بھوپال میں ایسے ناقدین جنہوں نے نجی ذوق وشوق کی خاطر جو تنقیدی تصانیف یا تنقیدی مضامین تحریر کئے ہیں ان میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، شاغل فخری،، مائل نقوی، کوثر چاندپوری، صفیہ اختر، ڈاکٹر ابومحمد سحر، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، سید حامد حسین، ڈاکٹر عبدالودود، شمیم احمد، ابراہیم یوسف،، حیدر عباس رضوی، مہدی جعفری، آفاق حسین صدیقی، نسیم شہنوی، نعیم کوثر، ڈاکٹر محمد نعمان خاں، پروفیسر ارجمند بانو افشاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے کچھ ادیبوں کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور کچھ کے تنقیدی مضامین وقتاً فوقتاً ملک کے نامور رسائل واخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھوپال کے ایسے ادیب جن کے ایم۔اے۔ سال آخر یا پی۔ ایچ ڈی کے تحقیقی و تنقیدی مقالے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر ابومحمد سحر، ڈاکٹر یونس حسنی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر عبدالودود، ڈاکٹر اخلاق اثر، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر ہارون ایوب، ڈاکٹر کشور سلطان، ڈاکٹر خلیل احمد مشیر، ڈاکٹر حدیقہ بیگم، حنیف کیفی، مختار شمیم ڈاکٹر انیسہ سلطان، ڈاکٹر محمد نعمان خاں، پروفیسر ارجمند بانو افشاں وغیرہ کے نام قابل توجہ ہیں اگر چہ ان تمام تخلیق کروں کی تصانیف تحقیقی ہیں لیکن ان کی کتابوں سے تنقیدی شعور کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

---

[۱] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۴۵

ان کے علاوہ بھوپال کے ناقدین میں ایک طویل فہرست ایسے تنقیدی مضمون نگاروں کی ہے۔ جن کے مضامین ملک کے ادبی رسائل واخبارات میں ہمہ وقت شائع ہوتے رہتے ہیں ان میں سید منظور حسین سروش، حکیم سید قمر الحسن، شرقی عثمانی، وجدی الحسینی، اختر سعید خاں، شرقی خالدی، شفیقہ فرحت، انعام الرحمٰن خاں، نعیم کوثر، اظہر راہی، خالد عابدی، اقبال مسعود، اقبال مسعود ندوی، حمیداللہ ندوی، سید شرافت علی ندوی، نظام قریشی، مختار شمیم، خالد محمود، عارف عزیز، محمد نعمان خاں پروفیسر ارجمند بانو افشاں وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری:

بھوپال میں ابتدائی دور کے ناقدین میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نام نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ ان کو ماہر تعلیم اور ماہر غالبیات بھی سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں انہیں تعلیم کی غرض سے بھوپال بلا کر ریاست کا مشیرِ تعلیم مقرر کیا گیا تھا اور یہاں رہ کر انھوں نے جبریہ تعلیم کا نظام قائم کیا اور اس کے علاوہ بھوپال میں رہ کر کئی علمی وادبی کام انجام دیتے رہے۔ ویسے تو انھوں نے تنقیدی مضامین، شعر، تراجم اور خطوط وغیرہ بھی تحریر کئے۔ لیکن ان کا سب سے اہم اور یادگار کارنامہ ''محاسنِ کلام غالب'' ہے جو حالی کی کتاب ''یادگار غالب'' کے بعد غالبؔ پر دوسری سب سے اہم تصنیف ہے۔ جس کو قیامِ بھوپال کے دوران عبدالرحمٰن بجنوری نے تصنیف کیا۔

''محاسن کلام غالب'' ''دیوانِ غالب'' کے لیے تحریر کردہ وہ مقدمہ ہے جو انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام دیوان غالب ترتیب دیتے وقت عبدالرحمٰن بجنوری نے تحریر کیا تھا۔ جس میں انھوں نے غالبؔ کی شاعری کے تمام پہلوئیوں کو ظاہر کیا ہے۔ جس سے غالب کی عظمت اور عالمی ادب میں غالبؔ کے مقام کا تعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں:

''بجنوری نے اپنے مقدمہ (محاسنِ کلام غالب) میں اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ غالبؔ کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں کیا جانا چاہیئے۔ جہاں تک اردو تنقید کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ بجنوری کا مقدمہ ''محاسن کلام غالب'' غالبیات اور اردو تنقید کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس کی اہمیت حالؔی کے مقدمۂ شعروشاعری سے کسی طرح کم نہیں ہے۔''[۱]

شاغل فخری:

بھوپال کے ناقدین میں شاغل فخری بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہے۔ ان کی کتاب ''تصورات اقبال'' اگست ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ جس میں کلام اقبال کے تحت انہوں ں ے درج ذیل موضوعات پر تنقیدی مضامین تحریر کئے ہیں۔ ''اسلام اور مومن'' ''روحانیت و مادّیت'' ''دین و سیاست'' ''ملوکیت و اشتراکیت'' ''قومیت بین الاقوامیت'' شعرو حکمت'' ''موت وحیات'' ''خودی'' اور ''بے خودی'' وغیرہ۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں ''خلاصہ اقبال کے عنوان سے اقبال کے کلام کا نتیجہ بھی درج کیا ہے۔

شاغل فخری اپنی تحریروں میں صاف زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین سے جو بھی نتائج سامنے آتے ہیں انہیں واضح کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اپنے مضمون حرف آغاز کے تحت ''تصورات اقبال'' میں پروپرائٹرنفیس اکادمی چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری لکھتے ہیں:

''شاغل مرحوم کی تحریر صاف، واضح اور عالمانہ انداز کی مرتب و مربوط تحریر ہوتی ہے جس میں ایک قسم کا شکوہ اور وقار بھی پایا جاتا ہے۔

۱؎ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۴۸

مسائل کی ترتیب عموماً منطقی انداز میں کرتے ہیں اور نتائج کو واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

''تصورات اقبال'' اقبال اور کلامِ اقبال کو سمجھنے میں طالبان کو کافی مدد دے گی اور یقیناً مفید و مقبول ثابت ہوگی۔''[1]

عبدالجلیل مائل نقوی:

عبدالجلیل مائل نقوی نے ۱۹۳۷ء میں بھوپال کے شاعر سراج میر خاں سحر بھوپالی کے کلام کو مرتب کر کے ''بیاض سحر'' کے نام سے شائع کیا۔ جس میں انہوں نے سحر بھوپالی کے سوانحی حالات اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ سحر بھوپالی کا زیادہ تر کلام ضائع ہو چکا ہے اور جو کلام دستیاب ہوا ہے اسے عبدالجلیل خاں مائل نقوی نے ''بیاضِ سحر'' میں درج کر دیا تھا۔

کوثر چاندپوری:

بھوپال کے ناقدین میں کوثر چاندپوری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے بھوپال میں رہ کر کئی برس اردو ادب کی خدمت کی۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار اور ناول نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''دیدۂ بینا'' ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ جس میں ''غالب کا فلسفۂ زندگی'' ، غلطی ہائے مضامین'' ''ریختی اور اس کے فنکار'' ''سہرا'' ''اکبر الہ آبادی کے طنزیہ و مزاحیہ اشارات'' ، ''تنقید و تجزیہ'' ''نیاز فتحپوری، شخصیت اور فن کے آئینے میں'' ''دیوانہ ہشیار (جگر مرادآبادی)'' ''سعادت حسن منٹو'' اور ''شوکت تھانوی (ایک کامیاب مزاح نگار)'' وغیرہ ۱۰ تنقیدی مضامین شامل کتاب ہیں۔ ان کے علاوہ دو مضامین تحقیق سے متعلق، دو طب سے اور ایک تاریخ سے متعلق ہے۔

---

[1] بحوالہ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۴۹۔۳۵۰

کوثر چاند پوری کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ''دانش وبینش'' ہے جوجنوری ۱۹۷۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔جس میں تنقیدی نوعیت کے مضامین کے عنوان درج ذیل ہیں :

''غالب کے خطوط''، ''پریم چند اور ہندوستانی تہذیب''، ''بچوں کا شاعر شفیع الدین نیّر'' ''ل۔احمد کا افسانوی آرٹ'' ''کرشن چندر بحیثیت افسانہ نگار'' اور ''فکر تونسوی کی طنز نگاری'' ہیں۔ ان مضامین کو ہم تاثراتی تنقید میں شمار کر سکتے ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جو ہندو پاک کے معروف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

کوثر چاند پوری کے مضامین کا تیسرا اور آخری مجموعہ ''فکر وشعور'' کے عنوان سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں شامل تنقیدی مضامین کے عنوان۔'' حافظ اور کلام حافظ'' ''غالب کے خطوط'' ''اردو شاعری میں سانیٹ'' ''شیدائے غزل حسرتؔ موہانی'' ''اردو افسانوں میں عصری آگہی'' ''حامد بھوپالی کا آہنگِ غزل'' ''خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری'' ''پریم چند (اچھا انسان بڑا ادیب)'' ''جہانِ غالب'' اور ''تنقید سے تحقیق تک'' ہیں۔

صفیہ اختر:

صفیہ اختر نے بھی کچھ اچھے تنقیدی مضامین قیامِ بھوپال کے دوران تحریر کئے تھے۔ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اندازِ نظر'' کے عنوان سے علوی بک ڈپو، بمبئی سے شائع ہوا۔جس میں ''گھر کا بھیدی'' کے عنوان سے ایک خاکہ اور ''ہنگامہ'' کے عنوان سے رپورتاژ شامل ہے۔اس کے علاوہ تمام تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ان مضامین میں صفیہ اختر نے بحث وتجزیہ کر کے ادب سے متعلق اپنے خیالات کا اظاہر بڑے ہی موثر انداز میں کیا ہے۔

''اندازنظر'' کے تنقیدی مضامین میں عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کے کردار ''شمن'' سے متعلق ''شمن کا نفسیاتی ارتقاء'' کرشن چندر کے رپورتاژ ''صبح ہوتی ہے'' کا تنقیدی تجزیہ، ''جوشؔ کی

انقلابی شاعری'' اور''ہندوستانی عورت کی ذہنی تربیت میں مہاتما گاندھی کا حصہ'' وغیرہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان کے پہلے مضمون ''دشمن کا نفسیاتی ارتقاء'' میں عورت کی فطرت اور نفسیات پر بڑے خوبصورت انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ اسی طرح سے دوسرے مضمون ''صبح ہوتی ہے'' کا تنقیدی تجزیہ کے ساتھ ساتھ کرشن چندر کے اسلوب کی تعریف اور ان کی تحریروں میں پائی جانے والی جذباتیت کا تنقیدی تجزیہ بھی کیا ہے۔

''جوش کی انقلابی شاعری'' میں جوش کی شاعری پر بحث کی ہے۔

''ہندوستانی عورت کی ذہنی تربیت میں مہاتما گاندھی کا حصہ'' بھی ایک منفرد انداز کا مضمون ہے۔ جس سے صفیہ اختر کی دور بیں نظر اور اسلوبِ نگارش کی داد دینا ہوگا۔

صفیہ اختر کے مضامین کے مجموعے ''انداز نظر'' کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مضامین میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے مضمون میں پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر گیان چندجین:

اردو ناقدین میں ڈاکٹر گیان چندجین بھی خصوصی مقام رکھتے ہیں۔ وہ بھوپال کے حمیدیہ کالج میں صدر شعبۂ اردو کے عہد پر فائز رہے اسی دوران انہوں نے داستان اور مثنوی پر تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چندجین کی دونوں کتابیں منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ہم ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے جب وہ تنقید پر قلم اٹھاتے ہیں تاریخی، سوانحی اور سماجی پس منظر کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے لسانیات، فن عروض، اور قدیم ادب جس میں خاص طور سے افسانوی اور داستانوی ادب پر اہم کام کیا ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کے مضامین اور کتب کا مطالعہ لوگ شوق سے کرتے ہیں۔ اور ان کی ادبی تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی:

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا شمار اردو کے معتبر اور معروف محقق و نقاد میں ہوتا ہے۔ بھوپال میں ان کا تقرر بحیثیت اردو کے لیکچرار کے عہدہ پر سیفیہ کالج میں ہوا تھا۔ تب سے لیکر انہوں نے بھوپال کی سرزمین کو ہی اپنی ادبی سرزمین بنالیا اور یہاں رہ کر انہوں نے کئی کتب اور مضامین تحریر کیئے۔ اس کے علاوہ کئی کتابوں پر تبصرہ اور دیباچے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تنقیدی تصانیف میں ''مطالعہ خطوط غالب'' ''مہدی حسن افادی'' ''اقبال ۱۹ویں صدی میں'' ''بچوں کے اقبال'' ''مطالعہ غبار خاطر''، اور ''اقبالیات کی تلاش وغیرہ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

''مطالعہ خطوط غالب'' میں عبدالقوی دسنوی نے غالب کے خطوط کے تمام پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ان خطوط کی علمی اور ادبی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ خطوطِ غالب پر کئی ادباء نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کڑی میں عبدالقوی دسنوی کی کتاب ''مطالعہ خطوط غالب'' بھی اپنی منفرد شناخت رکھتی ہے۔ خطوط غالب پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عبدالقوی دسنوی رقمطراز ہیں:

> ''سچ تو یہ ہے کہ خود غالبؔ کو کبھی اس کا خیال پیدا نہیں ہوا ہوگا کہ ان کے اردو خطوط اس قدر مقبول اور ان کی شخصیت کو جاننے اور پہچاننے میں اس حد تک مفید ثابت ہوں گے۔ یہ خطوط انہوں نے اپنے عزیزوں، دوستوں، جاننے والوں اور شاگردوں کو لکھے ہیں جن میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے علاوہ اس وقت کے مختلف مسائل، حالات و واقعات اور دوسری علمی، ادبی سیاسی باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے اتنے عرصہ بعد ان خطوط میں ہماری دلچسپیوں کے لیے کیا سامان ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ غالبؔ

کی اپنی ذہانت، ذکاوت اور صلاحیت تھی کہ انہوں نے ان خطوط کو اپنے
دور اور زمانے کا آئینہ دار ہی نہیں بنایا بلکہ اردو نثر میں وہ درجہ دلایا۔
جہاں اردو کے بہت کم نثر نگار پہنچ سکتے ہیں۔''[1]

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی دوسری تنقیدی کتاب ''مہدی حسن افادی'' ہے۔ جس میں انہوں نے مہدی افادی کی حیات، حالات زندگی، ادبی خدمات اور ان کے طرزِ اسلوب کا جائزہ لیا ہے تا کہ مہدی افادی کے مقام کا تعین اردو ادب میں آسانی کیا جا سکے۔

علامہ اقبال کی ولادت کے جشن کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں ان کی شخصیت اور شاعری پر کئی تحقیقی اور تنقیدی کام انجام دیئے گئے جن میں سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی کتاب ''اقبال انیسویں صدی میں'' بھی اسی کڑی کی تصنیف ہے۔ جس میں انہوں نے اقبال کی حیات، حالاتِ زندگی اور ابتدائی تعلیم کے علاوہ اقبال کی شاعری غزل گوئی، نظم گوئی، قطع گوئی پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں اقبال کے ابتدائی دور کے کلام کو بھی یکجا کر کے شاملِ کتاب کر دیا گیا ہے۔

اقبال پر پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی دوسری کتاب ''بچوں کے اقبال'' ہے۔ دراصل اقبال اردو کے ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری میں بچوں، نوجوانوں اور بزرگ حضرات سبھی کے لیے زندگی جینے کا پیغام ملتا ہے۔ اقبال قوم کے نونہالوں میں اعلیٰ انسانی صفات اور جوش وجذبہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی کئی نظموں میں ہمیں یہ خصوصیات مل جاتی ہے۔

مذکورہ کتاب میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے اقبال کی ایسی ہی نظموں کو یکجا کیا ہے اور ان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے ابوالکلام آزاد کی کتاب ''غبار خاطر'' کا تنقیدی تجزیہ ''مطالعہ غبارِ

---

[1] ''حرفِ اول'' مطالعہ خطوط غالب۔ از پروفیسر عبدالقوی دسنوی

خاطر'' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔جس میں انہوں نے خط نگاری، اردو کے منفرد خط نگار، مطالعہ غبار خاطر، حیات ابوالکلام آزاد کی اہم تاریخیں اور ابوالکلام آزاد نما، وغیرہ عنوانات کے تحت اپنی تنقیدی رائے قائم کی ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے علامہ اقبال پر لکھے گئے مضامین کو''اقبالیات کی تلاش'' کے عنوان سے شائع کیا جس میں اقبال پر ان کے ۹ مضامین شامل ہیں۔جن میں سے تین مضامین''اقبال کی نظم گوئی''(۱۹۰۱ سے ۱۹۰۵ تک)اقبال کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری''اور''بچوں کا اقبال'' وغیرہ مضمون تنقیدی ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے مذکورہ تحریروں کے علاوہ مضامین دیگر کتب میں آسانی سے مل جائے ہیں۔عبدالقوی دسنوی نے ، غالبؔ، حسرت، حالی، اقبال، چکبست، اکبرالہ آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیضؔ، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، خلیل الرحمٰن اعظمی، ساحر لدھیانوی، پرویزؔ شاہدی، قتیل شفائی، اختر سعید خاں، اور تاج بھوپالی وغیرہ پر لکھے گئے مضامین قابل ذکر ہیں۔عبدالقوی دسنوی کے مضامین ہندو پاک کے معروف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تنقیدی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان خاں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر دسنوی کی تنقید نگاری واقعیت، معروضیت اور جامعیت کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی رائے کو ثابت کرنے کے لیے کسی بھی تخلیق یا فن پارے سے بطور ثبوت حوالے بھی پیش کرتے ہیں تاکہ قاری بھی ان کی رائے سے متفق ہوسکے۔ انکے اس عمل کی وجہ سے ان کے مضامین معتبر اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔اور ان کے اخذ شدہ نتائج

دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور فکر انگیز بھی۔ عبدالقوی دسنوی کی تنقید میں
تاثرات کا عنصر بھی شامل ہے اور تحقیق کی متانت بھی۔''[۱]

ڈاکٹر ابو محمد سحر:

بھوپال کے اردو ناقدوں میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کا نام بھی نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب ''اردو میں قصیدہ نگاری'' قصیدے کے فن پر نہایت معتبر ہے جس میں انہوں نے فن قصیدہ نگاری کی تعریف اور تاریخ کے علاوہ اردو شاعری میں بحیثیت صنف سخن قصیدہ کی اہمیت، اس کی شاعرانہ خصوصیات، قصیدے کے زوال کے اسباب کے ساتھ ساتھ قصیدے کے مستقبل پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور قصیدے سے متعلق معاشی پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے اہم قصیدہ نگاروں کے قصیدوں پر بھی تبصرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے امیر مینائی پر اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی بعد میں اس کو ''مطالعہ امیر'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا انہوں نے ''مطالعہ امیر'' میں ''غزلیات امیرؔ'' قصائد، واسوخت، دیگر اصناف سخن، نثر نگاری، لغت نویسی اور امیرؔ استادِ سخن کی حیثیت سے وغیرہ عنوانات کے تحت امیرؔ مینائی کے کلام کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین کا مجموعہ ''تنقید و تجزیہ'' بھی منظرِ عام پر آیا۔ جس میں درج ذیل تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ''تنقید اور اصولِ تنقید'' ''غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ'' ناسخ معتقدِ میرؔ'' ''اقبال کے قومی تصورات اور عقیدہ پرستی'' ''حالی بحیثیت قصیدہ گو'' ''عزیز لکھنوی کی غزل گوئی'' غالب اور فلسفہ'' ''آزادی کے بعد اردو شاعری'' ''میر کی قصیدہ نگاری'' اور ''دبستان لکھنؤ کا تاریخی پس منظر اور تعیش پسندی'' ان تمام مضامین سے ڈاکٹر ابو محمد سحر کی ناقدانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کی تنقیدی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں:

---

[۱] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۶۰

> ''ڈاکٹر ابو محمد سحر تنقید میں فنی محاسن کے تجزیے کو تنقید کی اہم جولان گاہ متصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں موضوع کی اہمیت بھی ہے جو کہ ادب کی قدر و قیمت کے تعین میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک تنقید محض ہیئت اور اظہار بیان کی خوبیوں کی سراغ رسانی کا نام نہیں بلکہ خیالات کا جائزہ لینا اور ادیب کے نظریات و تجربات کے متعلق رائے قائم کرنے کا ذریعہ بھی ہے اس کے لیے ناقد کا غیر جانب دار ہونا ضروری ہے۔''[۱]

ڈاکٹر سید حامد حسین:

ڈاکٹر سید حامد حسین کا شمار بھوپال کے باصلاحیت ناقدین میں کیا جاتا ہے۔ وہ انگریزی ادب کے پروفیسر تھے اور اردو میں تنقید کی طرف خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے سے مضامین لکھنا شروع کیا۔ ان کی تنقید میں مواد گہرے مطالعہ کے بعد فراہم کیا جاتا ہے۔ ان کے مضامین میں نتائج گہرے مطالعہ کے بعد اخذ کئے جاتے ہیں۔ اسی لیے مضامین ان کی عرق ریزی اور فکری سنجیدگی کے غمّاز ہوتے ہیں۔ ان کی ابتدائی تنقیدی تحریروں پر ترقی پسند نظریات کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں تاثراتی انداز بھی ملتا ہے۔ لیکن زیادہ تر مضامین منطقی اور تجزیاتی نظریات پر مبنی ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسین کے تنقیدی نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر سید حامد حسین کے بیشتر مضامین کا تعلق عملی تنقید کے بجائے نظریاتی تنقید سے ہے۔ وہ مارکسی تنقید سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور اردو ناقدین میں انہوں نے احتشام حسین، ممتاز حسین اور اختر حسین رائے

---

۱ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۶۲

> پوری سے خاصہ اثر قبول کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں مذکورہ ناقدین کے اثرات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر حامد حسین کے ہاں تنقید میں تاثراتی انداز کے بجائے معروضیت اور منطقی اسلوب نمایاں ہے۔ وہ تنقید کو ایک منطقی اور شعوری عمل متصور کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ حیران کن یا چونکا دینے والی بات کہنے کے قائل نہیں بلکہ عرفان حقیقت کے قائل ہیں۔''[۱]

ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضامین کے دو مجموعے ''تحقیق اور حاصل تحقیق'' اور ''نثر اور انداز نثر'' کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح کا تنقیدی مطالعہ'' بھی شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر حامد حسین نے جو مضامین تحریر کئے ہیں ان کی فہرست کافی طویل ہے ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں۔ ''ادب اور صحافت'' ''جدید اردو تنقید کے رجحانات'' ''ہمارے ادبی نظریات'' ''اردو تنقید کے اصول اور مسائل'' ''نذیر احمد اور توبۃ النصوح'' ''پریم چند کی زندگی اور ان کا آرٹ'' ''دو افسانہ نگار، شفیق الرحمٰن اور خواجہ احمد عباس'' ''ذوق کی قصیدہ نگاری کے فکری عناصر'' ''مومن کا مکر شاعرانہ'' ''فانی کے مفروضات غم'' اصغر کی شاعری میں حرکت وعمل'' ''اردو میں مختصر ڈراما'' ''فنِ سوانح نگاری اور یادگار غالب'' خاکہ نگاری کا فن اور چند ہم عصر'' ''آزادی کے بعد اردو ناول'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین ہر پہلو پر بحث کرتے ہیں اسی لیے ان کے مضامین خاصے طویل ہوتے ہیں اور قاری ان مضامین سے زیادہ سے زیادہ معلومات آسانی سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اپنے مضامین میں مشرق ومغرب کے اعلیٰ اقدار اور اصولوں کو مدنظر رکھ کر جانچتے اور پرکھتے ہیں اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

---

[۱] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۶۴

جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر حامد حسین انگریزی زبان کے پروفیسر تھے۔ اور اردو زبان سے بے پناہ محبت کرتے تھے جب بھی اپنے طلباء کو انگریزی پڑھاتے تو بیچ بیچ میں اردو زبان کی خوبیاں بھی بیان کرنے لگتے اس طرح سے طلباء کے ذہنوں میں اردو زبان کی روشنی بھرنے کا م انجام دیتے تھے۔ اردو زبان سے ان کی بے لوث محبت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بھوپال کے معروف صحافی عارف عزیز اپنے پرخلوص انداز میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر حامد حسین ایک سخن فہم اور بزلہ سنج انسان تھے، حاضر جوابی میں بھی بڑا ملکہ رکھتے تھے، بعض اوقات ہلکے پھلکے جملوں میں گہری بات کہہ جاتے ان کی شخصیت میں ایک کشش تھی، انگریزی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا، مختلف زبانوں کے علم کا دفینہ تو اپنے سینے میں محفوظ رکھتے تھے لیکن ضرورت پیش آنے پر اس کا استعمال بھی جانتے تھے، ڈاکٹر صاحب کی جس خوبی کا سب کو اعتراف کرنا چاہیئے وہ اردو سے ان کی وابستگی تھی، حالانکہ اردو ان کی روزی روٹی سے متعلق کبھی نہیں رہی، انگریزی کے پروفیسر تھے، پھر بھی اول و آخر اردو والے نظر آتے، اردو کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا اس کے بدلے میں کچھ نہیں چاہا، عہدے، نام اور اعزاز دوسروں کو ملتے رہے، اس لحاظ سے ان کو اردو کا بے لوث سپاہی اور مخلص سفیر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''[۱]

ڈاکٹر عبدالودود:

یہ اردو درس وتدریس سے جڑے ہوئے تھے اور سیہور رڈ گری کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔

---

[۱] ''ڈاکٹر سید حامد حسین۔ اردو کے بے لوث خدمتگار''۔ مطبوعہ۔ روزنامہ ندیم۔ ۶/جون ۲۰۲۱

ایسا کہا جاتا ہے کہ کسی غلط فہمی کے بعد انکا قتل ہو گیا تھا۔ انہوں نے ''اردو نثر میں ادب لطیف'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تنقیدی مضامین ہندوستان کے معروف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالودود کا تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مضامین ڈاکٹر عبدالودود'' کے عنوان سے مرتب کر کے ۱۹۸۴ء میں ان کی اہلیہ صفیہ ودود نے شائع کرایا جس میں ڈاکٹر عبداودود کے ۹ مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

''شبلی کی قومی شاعری'' اقبال سہیل کا نظریہ حسن وعشق'' ''شاد عارفی کا فن'' ''رام دھاری سنگھ دنکر'' ''پاندان والی خالہ اور غفور میاں کا تجزیاتی مطالعہ'' ''اندرسبھا امانت، چند کمزور پہلو'' ''اردو زبان میں ہندوی کے نرم وشیریں الفاظ'' ''بھوپالی اردو کا سرمایہ الفاظ اور تخلص کی زبان'' اور ''شعبۂ اردو سفیہ کالج کے تحقیقی مقالات۔ ایک جائزہ'' وغیرہ۔ڈاکٹر عبدالودود کے تنقیدی مضامین میں موضوع سے متعلق تمام مواد آسانی سے مل جاتا ہے۔ ان کے مضامین ان کی تنقیدی بصیرت کے غمّاز ہیں۔ وہ تنقیدی مضامین میں سائنٹفک نظریۂ تنقید کو مدنظر رکھتے ہیں۔

شمیم احمد:

شمیم احمد کا شمار بھی بھوپال کے معروف ومقبول ناقدین میں ہوتا ہے۔ ان کے مضامین ملک بھر کے معروف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ایک طویل مبسوط مقدمہ ''بھوپال میں غزل'' کے عنوان سے ۱۹۶۶ء میں مرتبہ ''دلکش ساگری'' میں لکھا تھا۔ جس میں انہوں نے بھوپال کے ہر دور کے قدیم اور جدید نمائندہ غزل گو شعراء کے کلام کا تنقیدی جائزہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شمیم احمد نے اپنے مقدمہ کو ترمیم اور اضافہ کے ساتھ اپنے پہلے مضامین کے مجموعے

''ادراک'' میں نئی پرانی غزل کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۳ء میں دکن پبلیشر ز اورنگ آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ جس میں شامل چھ مضامین ۔ترسیل کا عمل'' ''ہم عصر تخلیق میں آزادی کے معنی'' ''ادیب اور ذہنی تعمیر'' ''اردو میں جدیدیت کا پیش روحالی یا شبلی'' ''نئی اردو نظم'' اور ''نئی پرانی غزل'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شمیم احمد کا مطالعہ کافی وسیع تھا جس کا اندازہ ہم ان کے مضامین کو پڑھ کر آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ وہ کسی بندھے ٹکے نظریہ کے پابند نہیں ہیں اور وہ آسان اور سلجھا ہوا تنقیدی ذہن رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد نعمان خاں رقمطراز ہیں:

> ''شمیم احمد تنقید کو خانوں میں بانٹنے کے قائل نہیں ان کی نظر میں تنقید کے مختلف خانوں میں بٹے ہوئے اصول ہوتے ہیں اور نہ نظریے۔ ان کے نزدیک تنقید نہ تو جمالیاتی ہوتی ہے اور نہ ہی تاثراتی ونفسیاتی نہ رومانی اور نہ ہی مارکسی وسائنسی۔ وہ تنقید کو صرف تنقید سمجھتے ہیں جس میں ناقد کے ذاتی طرز استدلال علمیت اور زیر بحث موضوع کی نوعیت کو ہی اولیت حاصل ہے۔ ان کے مطابق نقاد کے اصول نقد، اس کے اسلوب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور ہر نقاد اظہار خیال کے تئیں اسی قدر آزاد ہوتا ہے جس قدر کہ فن کار رہوتا ہے۔''[۱]

شمیم احمد نے ۱۹۸۱ء میں ''اصناف سخن اور شعری ہیئتیں' کے عنوان سے دوسری تصنیف شائع کی۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے یہ کتاب ادب سے متعلق معلومات حاصل کرنے اور ادب کو سمجھنے کے لیے مفید ہے جس میں شعری ہیئتوں میں ہونے والے نئے نئے تجربات اور مغربی ہیئتوں کے اثرات سے تعارف کراتے ہوئے تنقیدی تبصرہ پیش کیا ہے جس کو شمیم احمد نے مثالوں کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

---

۱ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۶۹

شمیم احمد کی کتاب ''اصناف سخن اور شعری ہیئتیں'' ۸ ابواب پر مشتمل ہے جس میں پہلے باب کے تحت صنف اور ہیئت کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں استعمال شدہ مواد کو آگے آنے والے ابواب میں وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ''مثنوی اور قصیدہ سے متعلق ہے جس میں مثنوی کی بحروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں غزل، رباعی، ریختی سے متعلق ہے۔ چوتھے باب میں مرثیہ، شہر آشوب، نظم اور گیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچواں اور چھٹے باب میں شعری ہیئتوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جبکہ ساتویں باب میں اردو شعری اصناف ترائلے، ہائکو اور آزاد نظم پر بحث کی گئی ہے۔ اور آٹھویں باب میں شعری اصطلاحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شمیم احمد کی یہ تصنیف اصناف ادب سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک اہم کتاب ہے۔

ابراہیم یوسف:

اگر چہ ڈامہ نگار ہیں۔ لیکن تنقید میں بھی ان کا کام قابل قدر ہے۔ انہوں نے جو ڈراموں کی ٹیکنیک اور دیگر تنقیدی مضامین تحریر کئے ہیں جس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اردو ڈراموں پر ان کی کتاب ''اندرسبھائیں'' میں ہمیں تنقیدی مواد آسانی سے مل جاتا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کے پہلے حصے میں اندرسبھاؤں کا پس منظر محرکات، ان کی تاریخی اہمیت ''لوک ناٹک'' اندرسبھا امانت اور دوسری قدیم اندرسنبھاؤں کا ذکر ملتا ہے۔

ابراہیم یوسف نے اس کے دوسرے حصے میں چار اندرسبھاؤں اندرسبھا امانت، ماہِ منیر معروف بہ اندرسبھا مداری لال، بزم سلیمان اور جشنِ پرستان کے متن کو ملا کر شائع کیا ہے۔ اس دور میں لکھنؤ میں یہ اندرسبھائیں ایک دوسرے کے مقابلے میں لکھیں جاتی تھیں ان کی اس کتاب کا بیشتر حصہ مضامین کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

پروفیسر مظفر حنفی:

بھوپال کے ناقدین میں مظفر حنفی بھی اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ ''شاد عارفی۔ شخصیت اور فن'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ جس میں کچھ حصہ تنقیدی نوعیت کا ہے۔

مظفر حنفی کے تنقیدی مضامین کے چار مجموعے ''نقد ریزے'' ''جہات وجستجو'' ''تنقیدی ابعاد'' اور ''مضامینِ تازہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے تنقیدی مجموعہ ''نقد ریزے'' میں درج ذیل تنقیدی مضامین خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں ''شفا گوالیاری کا فن'' ''کوثر چاندپوری شعلہ سنگ کی روشنی میں'' ''آواز کا متلاشی، خورشید احمد جامؔی'' ''مجتبیٰ حسین: بحیثیت خاکہ نگار'' ''طنز اور بسمل سعیدی'' گوپال متل بحیثیت نثر نگار'' ''نئی اور پرانی تنقید'' ''اردو ادب میں ہندوستانی عناصر کی تلاش'' ''اردو شاعری کے نئے ابعاد'' ''غالب اور نئے شاعر'' ''تجریدی شاعری اور ترسیل کا مسئلہ'' ''جدیدیت ایک تعارف'' وغیرہ۔

''جہات وجستجو'' مظفر حنفی کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جس میں درج ذیل مضامین ''اردو شاعری اور ہندوستانیت'' ''نئی غزل کے بیس سال (ہندوستان میں)'' ''غزل کی زبان'' ''جنگل کے مناظر اردو شاعری میں'' ''کیفؔی اعظمی: مثلث کا تیسرا زاویہ'' ''ایک اور تنقید گزیدہ شاعر۔ اعزاز افضل'' ''حسرت کی شخصیت'' ''ڈاکٹر عابد حسین بحیثیت طنز و مزاح نگار'' اور ''اردو ادب میں ادب اطفال'' تنقیدی اعتبار سے اہم ہیں۔

مظفر حنفی کا تیسرا تنقیدی مجموعہ ''تنقیدی ابعاد'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا اس میں وہ تنقیدی مضامین شامل ہیں جو انہوں نے ادبی نشستوں اور سیمناروں میں پڑھے تھے ان مضامین میں موضوع سے متعلق اہم معلومات ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مضامین تازہ'' جنوری ۲۰۱۰ء میں

شائع ہوا۔ جو۲۲ مضامین پر مشتمل ہے۔

تنقیدی موضوعات پر ان کی دو کتابیں ''جدیدیت تفہیم و تجزیہ'' اور ''تنقیدی نگارشات'' شائع ہو چکی ہیں۔ ''تنقیدی نگارشات'' چار حصوں پر منقسم ہے۔ جس کے حصہ اول میں ۱۴ حصہ دوم میں ۱۰ حصہ سوم میں ۱۰، اور حصہ چہارم میں ۵ مضامین شامل کتاب ہیں۔

اس کے علاوہ بھی مظفر حنفی نے متعدد کتابوں پر مقدمے، دیباچے، تبصرے اور پیش لفظ تحریر کئے ہیں۔ ان کے تنقیدی فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں:

> ''ان کی تنقیدی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک متوازن انداز نظر کے حامل نقاد ہیں انہوں نے تنقید کے لیے نظریہ کی پابندی کے بجائے فن پارے کی صفات کو ملحوظ رکھ کر اپنی آراء کا اظہار کیا۔''[۱]

مظفر حنفی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعے ''جہات و جستجو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف محقق اور ناقد گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر مظفر حنفی بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہیں اور اس حیثیت سے ان کا شمار برصغیر کی ممتاز ہستیوں میں ہوتا ہے ان کی اپنی آواز ہے اور لہجہ۔ انہوں نے ادیبوں اور ادبی مسائل کو بھی بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہی کی نظر سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید چاہے اشخاص سے متعلق ہو یا کوائف و مسائل سے، پیشہ ور نقادوں کی تنقید سے مختلف ہے اور یہی ان مضامین کی انفرادیت ہے۔''[۲]

---

۱ بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ص ۳۷۶

۲ مظفر حنفی ایک مطالعہ۔ مرتب فیروز مظفر۔ ص ۵۶

ڈاکٹر محمد نعمان خاں:

بھوپال کے ناقدین میں ڈاکٹر محمد نعمان خاں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے مضامین ملک کے نامور رسائل واخبارات میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے اپنے مقالہ ''بھوپال میں اردو انضمام کے بعد'' کے عنوان سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں مکمل کیا جس پر انہیں برکت اللہ یونیوسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل ہوئی۔ اپنے اس تحقیقی مقالے کو ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے ۲۰۰۶ء میں اسی عنوان ''بھوپال میں اردو انضمام کے بعد'' سے شائع کیا۔ یہ کتاب بھوپال کے تعلق سے بہت اہم ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ریاستِ بھوپال کے انضمام کے بعد کے شعری، ادبی ماحول عہد بہ عہد ادبی ارتقاء اور یہاں کے نامور شعراء اور ادباء کے ساتھ تمام اصناف کے تعلق سے جن فنکاروں نے ادب تخلیق کیا ہے انہیں قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی باب میں بھوپال کا جغرافیائی تاریخی، سیاسی، تہذیبی، سماجی، علمی، ادبی اور تعلیمی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب ''بھوپال میں اردو انضمام تک کے عنوان سے ہے۔ جس میں انہوں نے بھوپال میں ریاست کے انضمام سے قبل بھوپال میں اردو ادب کی صورتِ حال قلم بند کی ہے۔ تیسرے باب میں انہوں نے ''بھوپال میں اردو نثر انضمام کے بعد'' اس میں اردو نثری اصناف ڈرامہ، ناول، افسانہ، طنز ومزاح، رپورتاژ، ترجمہ، تحقیق اور اشاریہ سازی، تنقید، بچوں کے ادب، پر روشنی ڈالی ہے اور انضمام کے بعد بھوپال میں نثر لکھنے والوں کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

چوتھا باب ''بھوپال میں اردو شاعری (انضمام کے بعد)'' ہے۔ جس میں اردو کی اہم شعری اصناف پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے تعلق سے بھوپال کے شعراء کی پیش کی گئی شعری کے تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔

پانچواں باب ''بھوپال میں اردو صحافت (انضمام کے بعد)'' کے عنوان سے ہے۔ اور چھٹے باب میں انہوں نے ''بھوپال کے اردو تعلیم و تدریس، ادبی انجمنوں کے ساتھ ادبی تحریکات، اشاعتی اداروں اور کتب خانوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ اور ساتویں باب میں اس تحقیقی مقالے کا ماحاصل پیش کیا گیا ہے۔

درحقیقت یہ کتاب بھوپال کے اردو ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں بھوپال میں انضمام کے بعد کے شعر و ادب کی کم و بیش تمام تفصیل بحسن خوبی موجود ہے۔ یہ کتاب ایک زبردست تحقیقی کارنامہ ہے جسے تمام ادبی حلقوں نے بے حد سراہا ہے۔

ڈاکٹر محمد نعمان خان کی تحقیق و تنقید سے متعلق ۹ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) بھوپال ادب کے آئینے میں ۔۱۹۹۴ء

(۲) بھوپال میں اردو انضمام کے بعد ۔۲۰۰۶ء

(۳) تلاش و تجزیہ ۔۲۰۰۶ء

(۴) تفہیم و تاثر ۔۲۰۰۸ء

(۵) سرمایۂ ادب ۔۲۰۰۸ء

(۶) مشاہیر ادب اور بھوپال ۔۲۰۱۰ء

(۷) مونوگراف ملا رموزی ۔۲۰۱۶ء

(۸) مونوگراف ابراہیم یوسف ۔۲۰۱۹ء

(۹) فلسفۂ تعلیمات ۔۲۰۲۱ء

ڈاکٹر محمد نعمان کی پہلی کتاب ''بھوپال ادب کے آئینے میں'' شائع ہوئی جس میں تحقیق وتنقید سے متعلق ۹ مضامین شامل ہیں۔ان کی دوسری کتاب ''تلاش وتجزیہ'' کے نام سے منظر عام پر آئی اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر خالد محمود نے تحریر کیا ہے۔جس میں ان کے ۱۵ مضامین ہیں۔تفہیم وتاثر'' اور ''سرمایۂ ادب'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئیں۔تفہیم وتاثر میں انکے تحقیقی وتنقیدی ۱۲ مضامین، ۲ تاثراتی مضامین، ایک رپورتاژ اور ایک انٹرویو شامل ہے۔ان کی کتاب ''مشاہیر ادب اور بھوپال'' بھی تحقیق وتنقیدی معلومات پر مبنی ہے۔جس میں انہوں نے ان مشاہیر پر مضمون تحریر کئے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی بناء پر بھوپال کی ادبی سرزمین سے تھا۔اس مجموعے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں۔ ''سرسید احمد علی گڑھ کالج اور بھوپال'' ''نیاز فتح پوری اور بھوپال'' ''مولانا ابوالکلام آزاد اور بھوپال'' ''علامہ اقبال اور بھوپال'' اور ''عطیہ فیضی کا سفر بھوپال'' قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر ارجمند بانو:

پروفیسر ارجمند بانو کی ہمہ جہت شعری ادبی شخصیت کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔حمیدیہ کالج میں درس وتدریس میں پیشے کے ساتھ طلبہ کو مسلسل تنقید پڑھاتی ہیں۔تنقید اور تحقیق میں برکت اللہ یونیورسٹی سے ۷ اطلبہ Ph.D کی اسناد حاصل کر چکے ہیں اور ۸ سے زیادہ ریسرچ اسکالر یونیورسٹی سے رجسٹرڈ ہیں جو ان کی نگرانی میں Ph.D کررہے ہیں۔ارجمند بانو کی شعری، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات کو ناقدین اور مفکرین کے ذریعہ سراہا جاتا رہا ہے ان کی تحقیقی کتاب ''ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو'' ۲۰۱۲ء کو شائع ہو کر مقبولِ عام ہوئی۔ یہ دراصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو انھوں نے سیفیہ کالج سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں تحریر کیا تھا۔اس کے علاوہ ان کی شاعری اور نثری تحریریں، تنقیدی اور تحقیقی مقالات ملک کے بیشتر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

آل انڈیا مشاعروں، ریڈیو اور دوردرشن میں ارجمند بانو کا کلام نشر ہوتا رہتا ہے۔ وہ آل انڈیا سیمینار اور ورک شاپ وغیرہ میں شرکت کرتی رہتی ہیں۔ سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالے اور اکثر رسائل کے خصوصی شماروں کے لیے تحریر کردہ مقالے ملک کے نامور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نگارشات افشاں'' کے عنوان سے زیرِ طباعت ہے۔ ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی روشنی میں وہ سائنٹفک نظریہ کی حامل نظر آتی ہیں وہ ادب کو افادیت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور ان کی رائے بہت جامع اور سچّائی پر مبنی ہوتی ہے۔

پروفیسر ارجمند بانو کی تنقیدی اور تحقیقی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ملک کے نامور شاعر، نثر نگار، ناقد اور خاکہ نگار پروفیسر خالد محمود، پروفیسر ارجمند بانو پر تحریر کردہ اپنے خاکے'' بھوپال کی ایک اور علم بردار خاتون: ارجمند بانو'' میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ارجمند بانو کا انداز بیان سلیس، دلکش اور تجزیاتی ہے اپنی بات کو پرزور پر اثر بنانے کے لیے اہل علم کے اقتباسات کا برمحل استعمال کرتی ہیں جو ان کے شوق مطالعہ کا ثبوت ہے ان کی تحریر سلجھی ہوئی اور دلائل مضبوط ہوتے ہیں۔ واقعات کے انتخاب اور مواد کی پیشکش میں منفی باتوں سے گریز اور دلآزار گفتگو سے اجتناب کرتی ہیں جو ان کی شرافت نفسی کی دلیل ہے۔ اشخاص میں خامیاں تلاش کرنے کے بجائے خوبیاں اجاگر کرنا پسند کرتی ہیں۔''[۱]

پروفیسر ارجمند بانو کی کتاب ''ریاست بھوپال اور مشاہیر اردو'' پر ماہنامہ ''کتاب نما'' نئی دہلی جلد ۵۲۔ شمارہ ۵ مئی ۲۰۱۲ء میں پروفیسر محمد فاروق انصاری NCERT نئی دہلی کا تبصرہ شائع ہوا جس میں وہ اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

---

[۱] بھوپال کی ایک اور علم بردار خاتون: ارجمند بانو۔ مطبوعہ روزنامہ ''ندیم''۔ ۸/اگست ۲۰۲۱۔ ص۴

''مجموعی طور پر یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جو ریاست بھوپال کی علمی اور ادبی تاریخ کو ترتیب وار بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اور اسے یقینی طور پر ہر ادب نواز دوست سے قبولیت کا شرف حاصل ہوگا۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے قیمت بھی مناسب ہے۔ لائبریریوں میں اس کی موجودگی یوں بھی ضروری ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت اس کتاب کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔''[1]

اقبال مسعود:

اقبال مسعود کا شمار بھوپال کے اہم ناقدین میں ہوتا ہے۔ وہ بیکوقت صحافی، شاعر اور بہترین افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ کچلے اور پسماندہ طبقے کے مسائل کو اخبارات کے ذریعہ بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اردو اکادمی سے جڑے رہ کر انہوں نے اردو کی ترقی کے لیے زبردست خدمات انجام دیں۔

مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ان کی نظامت اعلیٰ ادبی اور تنقیدی شعور کی غماز ہوتی ہے۔ زمانہ قدیم میں مشاعرے تنقید کی کسوٹی مانے جاتے تھے اور آج بھی اچھے معیاری مشاعرے ادبی تنقید میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اقبال مسعود مشاعرے کے شاعروں پر ایسے جامع تبصرے کرتے ہیں کہ ان کے اعلیٰ تنقیدی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ندیم، آفتاب جدید، الحمراء ''صدائے اردو'' ''تمثیل'' جیسے رسائل سے مدیر کی حیثیت سے وابستہ رہ کر انہوں نے صحافت اور تنقید میں اپنے جوہر دکھائے۔ ان نامور اخبارات و رسائل میں ان کے اداریہ اور اس کے علاوہ ملک کے مقتدر رسائل میں اور عصر حاضر کے ادباء اور شعراء کی طبع ہونے والی کتابوں میں ان کے تنقیدی مضامین اور تبصرے شامل اشاعت ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اعتبار حرف'' منظرِ عام پر آچکا ہے۔

---

[1] ماہنامہ ''کتاب نما'' جلد ۵۲۔ شمارہ ۵ مئی ۲۰۱۲۔ ص ۶۸

نعیم کوثر:

نعیم کوثر بہترین افسانہ نگار اور صحافی ہونے کے ساتھ ناقد بھی ہیں۔ ظاہر ہے ایک تخلیق کار جب ہی اچھی تخلیقوں سے ادب کا دامن بھر سکتا ہے۔ جب وہ خود ناقدانہ شعور رکھتا ہو۔ تخلیق کار کا تنقیدی سے جو گہرا تعلق ہے وہ جگ ظاہر ہے اسی لیے تنقید ہمیشہ تخلیق کار کی رہنمائی کے لیے موجود رہتی ہے۔ یہی حال صحافت کا بھی ہے اور خاص طور سے کسی اخبار یا رسالہ کے معیار کو طے کرنا اور قائم رکھنا مدیر کی بہترین تنقیدی صلاحیت کا ضامن ہے۔

نعیم کوثر نے ''صدائے اردو'' کو بھیجی جانے والی بیشتر نئی کتابوں پر تبصرے تنقیدیں اور تجزیے شائع کیے جن میں سے اکثر خود انہوں نے بھی تحریر کیے۔ اردو ادب کے نامور تخلیق کار اور بین الاقوامی شہرت کے مالک پروفیسر مظفر حنفی (مرحوم) جو بیک وقت شاعر، ادیب، محقق، ناقد، افسانہ نگار بھی ہیں ان کی کتاب ''مضامین تازہ'' پر نعیم کوثر نے تبصرہ کیا جو پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' ۱۶/اپریل ۱۵ مئی ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے متعلق نعیم کوثر لکھتے ہیں:

> ''موصوف (مظفر حنفی) حق گو اور حق شناس ادیب ہیں۔ فکر و شعور میں عزم و پختگی کے ساتھ جاہ و جلال اور دلکشی ہے۔ ان کی نثر میں حسن بیان اور گہری شعریت ہے کہیں کہیں انداز جارحانہ ہو جاتا ہے۔ لیکن تحقیق و تنقید دونوں گلے ملتی نظر آتی ہیں اور نقطہ نظر لچکدار اور عصری تقاضوں پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ وہ اس میدان میں آج بھی فعال اور سرگرم ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں یوں تو تمام مضامین انتہائی جامع اور بے باک نگاری کا نمونہ ہیں۔ لیکن ''میراجی''، ''عینی'' اور ''اردو فکشن

احساسات''، ''اقبال میری نظر میں''، ''ہندوستان کی تحریک آزادی میں خواتین کا حصہ''، ''معین احسن جذبی بحثیت غزل گو''، ''ابومحمد سحر کچھ یادیں'' اور ''ساغر نظامی کی شعری کائنات'' ایسے مضامین ہیں جن میں تحقیق اور تنقید دونوں ہم آہنگ ہیں۔''باتیں کوثر چاندپوری کی'' دیباچہ نگاری کا بالکل نیا انداز نگارش ہے۔ برسوں سے آج تک کسی کتاب کا پیش لفظ یا دیباچوں کا مطالعہ کریں تو سوائے تخلیق کار کی قصیدہ نگاری، چند منتخب اشعار افسانوں کے اقتباس کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ متذکرہ مضمون بھی زیر طبع کتاب کا پیش لفظ ہے۔جس میں روایتی انداز تحریر اور اسلوب سے انحراف ہے۔ انہوں نے بڑی قدرت اور ایمانداری سے اپنے جذبات سے، سلامت طبع اور جودت ذہن سے کوثر چاندپوری کے پیکر کو حسن، کشش اور توانائی بخشی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ فتحپور کے نیاز فتح پوری، ابومحمد سحر اور مظفر حنفی کی حیثیت ایک ''مثلث'' کی ہے جس کا ہر زاویہ نگینے کی طرح جڑا ہوا بھی ہے اور الگ بھی (کوثر صاحب کے ایک جملے کا سرقہ)''[۱]

بدؔر واسطی کے شعری مجموعے ''تو میں کہاں ہوں'' پر نعیم کوثر کا تبصرہ ''صدائے اردو'' کے یکم اپریل ۲۰۱۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بدؔر واسطی درحقیقت بھوپال کے ابھرتے ہوئے بہترین ہونہار شاعر ہیں جن کی شاعری میں روایت کی پاسداری کے ساتھ جدید افکار کا بہترین سنگم ہے۔ بدؔر واسطی کے مذکورہ بالا شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے نعیم کوثر لکھتے ہیں:

۱؎ پندرہ روزہ صدائے اردو۔۱۶/اپریل ۱۵/مئی ۲۰۱۰ء۔ص ۱۲

''بدؔر واسطی نے اپنی شاعری میں تجربے کی ایک مشترک دنیا سے افادہ حاصل کیا ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کی نئی تعبیر کی اقدار سحر جگاتی ہے۔ ان کے احساسات اور مشاہدات کا تفکّر ، ان کی ذات کو نئی اقدار سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے بدؔر واسطی کے کلام میں بے لطف جوش کی کیفیت، رومانیت اور جذباتی واویلہ نہیں ہے۔ بلکہ ارتقاء کی ایک فطری خوشگوار رفتار نظر آتی ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت کا مسئلہ ہو یا نئی زندگی کی نئی تعبیر کا تصور، بدؔر عصرِ جدید کا منظر اپنی غزلوں میں شاداب صورت میں ڈھال لیتے ہیں۔ان کے یہاں زندگی کا عمل پیہم ہے لیکن نفاست اور نزاکت کے ساتھ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو المیہ کی علامت میں محسوس کیا ہو لیکن الفاظ کی آراستگی اور انتخاب میں احساسات میں محرومی، کرب اور قرار کو اجاگر ہونے سے روکا ہے۔ اسی وجہ سے کلام میں انفرادیت کا رجحان اور غنائیت ہے۔ بدر واسطی کی عمر ۴۵ سال ہے ۳۰ سال قبل وہ شعروادب کے مدوجذر میں غوطہ زن ہوئے اور تب سے فن کو گیرائی کے ساتھ اپنی ذات اور معاشرے کے دوسرے مظاہر پر ترجیح دیتے رہے۔ریاضت اور محنت ان کی مساعی کا طرۂ امتیاز ہے۔انہوں نے شعریت کے بحر بے کنار کو ایک جست میں عبور کرنے کی نیت نہیں باندھی بلکہ متاخرین اور عصرِ جدید کے شعراء ادیبوں، کی تخلیقات کا بھرپور مطالعہ کیا۔عروض کی پیچیدگیوں کو بوجھا اور پھر ایک شعاع چرا کر فہم وادراک کو روشن اور متحرک کیا ہے۔ بدؔر واسطی خوش مزاج ،مخلص، حساس اور ہمدرد

انسان ہیں۔ شاید اسی خصلت نیک میں ان کی شاعری میں تنوع اور رنگینی،
فراواں کی ہے۔[۱]

نعیم کوثر نہ صرف صدائے اردو کے ادبی معیار کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہے بلکہ ان کے تنقیدی شعور اور ان کی غیر جانبدار ذہنیت کا اندازہ ان تحریروں سے ہوتا ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ''صدائے اردو'' کے اداریوں کی شکل میں تحریر کی ہیں اور جن میں عصر حاضر کے رسائل کی پالیسیز کے ساتھ ان کی خوبیوں اور ان کے بلند معیار کو اپنے تبصروں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ ۱۵/اپریل ۲۰۰۵ء کے شمارے میں انہوں نے ''افکار'' اور ''شب خون'' کی خوبیوں اور ان کے مدیروں کی اہلیت اور صلاحیت پر تبصرہ کیا ہے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۵ء میں بھوپال سے جاری ماہنامہ ''افکار'' نے کراچی جا کر ۲۰۰۳ء میں دم توڑ دیا۔ ۵۸ سال کے کامیاب سفر میں ''افکار'' نے منفرد پہچان بنائی اور اس کے مجاز، منٹو، مجنوں، اختر حسین رائپوری، جوش، فیض، ندیم، حفیظ، سردار جعفری، غالب، امیر خسرو، سجاد ظہیر، جیسی اہم ادبی شخصیتوں پر خصوصی نمبر آج اردو شعر و ادب میں یادگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ افکار کا آخری شمارہ صہبا لکھنوی کی ادبی خدمات پر مشتمل تھا۔ اس تاریخی ادبی رسالے کا راہی ملک بقا ہونا اس صدی کا بڑا المیہ ہے۔ اب ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد کے ادارتی عملے کی ایک اطلاع کے مطابق اس رسالے کی اشاعت امسال ماہ جون کے شمارے کے بعد بند کر دی جائیگی۔ اور اس طرح شب خون کا ۳۹ سال کا سفر تمام ہو جائیگا۔''[۲]

---

۱ صدائے اردو۔ یکم اپریل ۲۰۱۱ء۔ ص ۱۵

۲ صدائے اردو۔ جلد ۴۔ شمارہ ۱۶۔ ۱۵/اپریل۔ ۲۰۰۵ء۔ ص ۱

شب خون کا شمار اردو کے ان رسائل میں ہوتا ہے جنہیں نظریہ ساز اور تاریخ ساز کہا جاتا ہے۔ اور جنھوں نے اردو ادب کو ایک نئی سمت عطا کی۔ اردو زبان کے ادبی و تہذیبی سرمایہ کی ترویج و اشاعت میں اردو رسائل کا اہم رول رہا ہے۔ ان رسائل کا اجراء کبھی منفعت بخش کاروبار نہیں رہا۔ لیکن لگن اور شوق کی وجہ سے ایسے کئی رسائل جاری ہوتے رہے جنھوں نے ادبیات پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔ ان میں ''ہمایوں،، مخزن، زمانہ، نیرنگ خیال، نگار، ساقی، ادب لطیف، سویرا، جادہ، افکار، شاہراہ، گفتگو، کتاب، نقوش، شاعر'' وغیرہ اہم نام ہیں۔

''نگار'' کی اشاعت سے اردو زبان و ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ نیاز فتح پوری اس رسالے کے روحِ رواں تھے۔ انہوں نے نگار کے ذریعہ اردو ادب کو ایک نئی سمت اور منزل سے روشناس کرایا۔ کبھی کبھی تو وہ پورا رسالہ خود لکھتے تھے اور کئی ادبی بحثوں کا سلسلہ شروع کرتے تھے۔ آج بھی ''نگار'' کی فائلیں۔ اردو طبقے کے لیے ایک قیمتی سرمایہ سے کم نہیں ہیں خصوصی طور پر ان کے مختلف خصوصی شماروں نے بڑی اہمیت حاصل کی۔

> ''نگار کے نقش قدم پر شب خون نے بھی اپنی راہ طے کی چونکہ زمانہ بدل چکا تھا۔ موضوعات میں تبدیلی آچکی تھی معیار بھی بدل رہے تھے۔ ادبیات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگیا تھا۔ اس لیے شب خون نے شمس الرحمٰن فاروقی کی سرپرستی میں اپنے لیے ایک نئی سمت اور راستہ کا تعین کیا۔ شب خون کا پہلا شمارہ مئی ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا اس پر جون ۱۹۶۶ء تاریخ پڑی تھی۔ اس کے ابتدائی شماروں کے مدیر معروف نقاد اور محقق ڈاکٹر اعجاز حسین تھے الہ آباد سے نکلنے والے اس ادبی رسالے کو ملک کے بیشتر لکھنے والوں کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ ابتدائی شماروں ہی میں پروفیسر

احتشام حسین اور عمیق حنفی کی بحث سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ شب خون عام ادبی رسائل سے کچھ ہٹ کر ہوگا۔ ان ابتدائی شماروں پر فاروقی کا نام کہیں درج نہیں تھا۔ البتہ یہ سب جانتے تھے کہ شب خون کے پس پردہ انہیں کا ذہن اور قلم کام کر رہا۔

ترقی پسندی کی لے کمزور پڑ چکی تھی تقسیم ہند اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اس تحریک میں زور اور دبدبہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس تبدیلی کے اثرات ترقی پسند بھی محسوس کر رہے تھے اور اس کے مخالفین بھی اس کمزوری سے واقف تھے۔ شب خون ایسے میں ان کے لیے ایسا آرگن ثابت ہوا جہاں وہ اپنی بات کھل کر کہہ سکتے تھے اور نئے تجربات کے لیے بھی وسیع گنجائش نکل آئی تھی۔ اس طرح اگر ۱۹۶۶ء سے لیکر ۲۰۰۵ء تک کے شب خون کے سفر کی داستان کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا یہ داستان اعتراف اور اختلاف سے ہوکر انحراف پر ختم ہوتی ہے۔

ابتدائی دور میں اس رسالے میں وہ سب لوگ چھپتے تھے جو کسی بھی مکتب فکر سے متعلق ہوں لیکن رفتہ رفتہ یہ ایک نئے رجحان کا نمائندہ بنا جسے جدیدیت کا نام دیا گیا اور پھر یہ مکمل طور پر جدیدیت کے رجحان کو تحریک میں بدلنے کے آرگن کا کام کرنے لگا۔

شب خون کے صفحات پر ابتداء میں تخلیقی ادب کے ذیل میں بہت سے لایعنی تجربات کیے گئے لیکن رفتہ رفتہ اس سے انحراف کیا جانے لگا۔ شعر و شاعری کے میدان میں کئی نئے نام آئے۔ افسانوں میں مبہم علامتی

اور تجریدی کہانیوں کی دھوم رہی لیکن تنقید اور تحقیق کے میدان میں فاروقی کی شخصیت اتنی قد آور نکلی کہ ان کے علاوہ اور کوئی نام ابھر نہیں سکا۔

اس میں شک نہیں کہ فاروقی نے تنقید کے میدان میں جو سفر اپنے بے لاگ اور بے باک تبصروں سے شروع کیا تھا وہ جاری رہا اور متفرق مضامین سے لیکر افسانوی ادب اور میر تقی میر تک پہنچتے پہنچتے وہ اسکے مرد میدان بن چکے تھے۔ آپ ان سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کی نظر اور علمیت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ آج فاروقی شاعری کر رہے ہیں۔ افسانہ اور ناول بھی لکھ رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب میں ایک قد آور ناقد کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

شب خون اور فاروقی یک جاں دو قالب تھے۔ اب جبکہ شب خون کی اشاعت ۳۹ برسوں کا سفر طے کر کے بند کی جارہی ہے۔ دراصل یہ ایک دور کے خاتمہ کا اعلان ہے۔ شب خون کا یہ سفر ایک مخصوص ادبی حلقہ کے لیے بڑا سازگار رہا۔ ادبیات میں بھی اس سے کئی قابل قدر اضافے ہوئے۔ مخصوص ادبی حلقوں میں اس کی کمی بری طرح محسوس کی جائے گی۔

لیکن ہمیں امید ہے کہ فاروقی اب فروغِ اردو کونسل میں اپنی نئی ذمہ داریاں اسی خوش اسلوبی سے پوری کریں گے۔ جو ان کے مزاج کا خاصہ ہے اور اردو کی ترویج و بقاء کے لیے برسرپیکار رہینگے۔''[۱]

نعیم کوثر نے باقاعدہ تنقیدی مضامین اگرچہ کم لکھے ہیں لیکن جب بھی تنقید اور تبصرے کے لیے قلم

---

[۱] پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد۔۴ شمارہ ۱۶۔ ۱۵/ اپریل ۲۰۰۵ء۔ ص ۱

اٹھایا حقیقتوں سے گریز نہیں کیا۔ ان کی تنقید بھی بے لاگ اور بے باک ہوتی ہے۔ کوثر چاند پوری کے فن اور شخصیت پر ڈاکٹر نازنین خان کی تحریر کردہ کتاب ''وقارِ علم و حکمت: کوثر چاند پوری'' میں نعیم کوثر کا تنقیدی مضمون ''ایک بے نیاز مفکر، محقق، ناقد، افسانہ نگار اور حاذق طبیب'' کے عنوان سے شامل اشاعت ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے والد کوثر چاند پوری کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر گہری روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون میں کوثر چاند پوری کے مستند سوانحی حالات اور ان کی افسانہ نگاری پر نہایت جامع تبصرہ کیا ہے۔ نعیم کوثر لکھتے ہیں:

''کوثر چاند پوری ۱۹۴۷ء تک اپنے فنی ارتقاء کی پیمائش نہ کرتے رہے ہوں لیکن اس زمانے کے تحریر کردہ ان کے افسانے رومان اور جنسیات کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ لیکن بعد میں وہ ایک پختہ شعور کے مالک بنتے گئے واقعات اور مسائل کی پرتیں اُتارتے ہوئے وہ اس گہرائی تک پہنچتے ہیں جہاں انکا قاری وحدت تاثر کے خمار سے چونک پڑتا ہے۔ کسان اور محنت کش طبقہ، دفتری ملازمین، جاگیرداری کے تانے بانے، حکومت کی پالیسیوں کا انجذاب، خانگی امور کے تاریک پہلو اور معاشرہ کے نشیب و فراز کوثر چاند پوری کی کہانیوں کے مرکزی خیال کو حسن و جمال عطا کرتے ہیں۔ جدیدیت نے افسانے کو اس کے قاری سے دور کر دیا۔ پریم چند نے ہندوستانی معاشرت اور ثقافت کو بنیاد بنا کر جس طرز کے افسانے کی بنیاد رکھی تھی جدیدیت نے مغربی نظریات کی گھٹی میں گھول کر اتنا مبہم اور پیچیدہ بنا دیا کہ قاری نے افسانوں کی کتابیں اور رسائل سے منھ موڑ لیا۔ اس دور میں حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، سہیل عظیم

آبادی اور کوثر چاند پوری چند ایسے افسانہ نگاروں میں تھے جو پریم چند کی راہ پر کامیابی سے گامزن رہے اور بیانیہ کی دلکشی اور اثر انگیزی کو برقرار رکھا۔ ان تخلیق کاروں نے قدامت اور جدت کو سمو کر فن میں بلندی اور تازگی پیدا کی ....

.... یہ حقیقت ہے کہ کوثر صاحب کے افسانے اور ناول نہ صرف پریم چند کے عہد کو ہمارے عہد سے جوڑتے ہیں بلکہ اس عہد کے زندہ مرقعے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں انسانی ہمدردی اور دردمندی کا احساس موجزن رہتا ہے۔ یہ کہنے میں راقم الحروف کو کسی طرح کا تکلف نہیں ہے کہ کوثر صاحب نے اپنے فن میں کسی کی تقلید نہیں کی انہوں نے زندگی اور سماج کے پیچ وخم اور نشیب و فراز کی عکاسی کے ساتھ انسانی نفسیات کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔''[1]

''صدائے اردو'' کی اکثر و بیشتر اداریہ نعیم کوثر نے تحریر کئے ہیں۔ جن میں ادب اور سماج، سیاست اور زبان ادب کے خلاف ہورہی سازشیں اور اکادمیز کی ناقص کارکردگی، اردو زبان کونقصان پہنچانے کی اردو دشمن عناصر کی کوششیں اور عصر حاضر کے بیشتر مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان کا لہجہ تیکھا اور خیالات سچائی پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ نہایت بے باکی کے ساتھ موجودہ دور کے مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' کے ۱۵ دسمبر ۲۰۰۷ء کے شمارے میں نعیم کوثر نے جو اداریہ لکھا ہے۔ اس میں اردو زبان کی زبوں حالی پر آنسو بہائے ہیں اور اردو کے سنجیدہ مسائل کو بڑی بے باکی

---

[1] وقارِ علم وحکمت: کوثر چاند پوری۔ از ڈاکٹر نازنین خان۔ ص ۲۵۔۲۶

اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''صدائے اردو اس مسئلے پر قارئین کرام کی رائے جاننا چاہتا ہے۔ میری حقیر رائے میں معاملہ قاری کی گمشدگی یا اس کی عدم دلچسپی کا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کا ''طالبِ علم'' دن بہ دن کم ہو رہا ہے۔ اردو ادیب، دانشور، (خصوصاً مدرس) اور انجمنیں اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن میدانِ عمل میں اترنے سے ہچکچاتے ہیں کیونکہ بھاری بھر کم تنخواہ اور مراعات نے ان میں ''ماروتی کلچر'' کی بو باس بھر دی ہے۔ پیدل اور سائیکلوں پر کالج / یونیورسٹی میں آنے والے پروفیسرز ٹائی سوٹ میں آج کل نئی نئی کاروں سے آتے جاتے ہیں۔ اپنے طلباء کو امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ نسخے تھما دیتے ہیں۔ نوٹس کی فوٹو کاپیاں تقسیم کردی جاتی ہیں اور پی ایچ ڈی کی ٹکسالوں کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے۔ گھر بیٹھے مقالے تیار مل جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں بیرونی ماہر گائڈ کی تجویز پر نامزد ہوتا ہے جو فوری طور پر مقالہ منظور کر دیتا ہے اور Not to be Published کا نوٹ بھی درج ہو جاتا ہے۔ یہ نوٹ تیر بہدف ٹائپ کا نسخہ ہے جو طالب علم، گائڈ اور ماہر موصوف کو کئی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ مثلاً پرانی کتابوں یا پاکستانی رسائل سے نقل اور شائع ہونے والے مقالے کی بے شمار کمزوریوں کا اجاگر ہونا وغیرہ وغیرہ۔

ایسے دانشور ادیب اور پروفیسر زبان کی بقاء ترقی اور فروغ کے لیے متحد ہو کر آواز اٹھانا اپنے Status کی بے توقیری سمجھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ریاستی اردو اکادمیز، ادارے اور نام نہاد انجمنیں جمہوریہ ہند کے

آ ئین کی دفعہ 350-A کے تحت اردو میڈیم اسکولوں کے قیام اور 14 سال کی عمر تک بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کے لیے تحریک چلانے سے کتراتی ہیں اس کے علاوہ ہم ایسے ادیبوں/شاعروں سے واقف ہیں جن کے بچے اردو نہیں پڑھتے ۔ یوں اردو کو در بدر کر دیا گیا ہے ۔ اور ہم اردو والے حکومت پر سرد مہری اور بے اعتنائی کا الزام رکھتے ہیں ۔ مزید برآں اردو کی زبوں حالی پر کوئی سر پھرا سیمینار، مذاکروں میں آواز اٹھاتا ہے تو دانشور چلاّ کر اسے خاموش کر دیتا ہے ۔ اور بیبا نگِ دُھل کہتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے ۔ جب تک سہ لسانی فارمولا میں ترمیم نہیں کی جاتی اور ثانوی/ اعلیٰ درجات میں اردو کو مناسب اور مستقل مقام نہیں دیا جاتا یہی صورتِ حال جاری رہے گی ۔

ان حالات میں قاری کی تلاش اور گمشدگی کی ''ادبی بحث'' بے معنی ہے ۔ ضروری یہ ہے کہ ہم گلی گلی کوچے کوچے ہر دروازے پر دستک دیں اور کھوجیں ان طلباء کو جو میرؔ، غالبؔ، فراقؔ اور فاروقی، نارنگ کے سمجھدار قاری بن سکیں ۔ وجوہات اور بھی ہیں ۔ آپ بھی بتائیں ۔''[1]

پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' کے ۱۵/جون ۲۰۰۸ء کے شمارے میں نعیم کوثر نے بحیثیت مدیر جو اداریہ لکھا ہے اس میں بھی اردو محبت اور اردو کے مسائل پر پسینہ بہانے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور ان منافقوں کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو اردو کے جھوٹے خدمتگار بن کے اسے مٹانے کی کوششوں میں مصروف ہیں وہ لکھتے ہیں :

---

[1] پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' جلد ۶ ۔ شمارہ ۔ ۹ ۔ ۱۵/دسمبر ۲۰۰۷ء ۔ ص ۱

''اردو کی زبوں حالی کے لیے کون ذمہ دار ہے، یہ ایک مشکل سوال رہا ہوگا۔لیکن گذشتہ ۲۵ سالوں کا تجزیہ کیا جائے تو جواب آسانی سے مل سکتا ہے۔محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے دورِ اقتدار والے صوبوں میں اردو اکادمیز کے قیام کی ہدایت دی اور بعد میں (۱۹۹۶ء) میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تشکیل کی گئی۔ برلا کے سرسوتی سمّان،جین کے گیان پیٹھ ایوارڈ،حکومت مدھیہ پردیش کا اقبال سمّان، غالب ایوارڈ اور بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے علاوہ کئی ساہتیہ اکادمیوں کا اعزاز بھی وجود میں تھے۔ان میں سے چار ایوارڈ لکھپتی بناتے ہیں۔صوبائی اکادمیز کے بھی کئی نقدی انعامات ملکی پیمانے پر قائم ہیں۔

''اردو کے بڑے ادیبوں کی نگاہیں قیمتی انعامات کی طرف اٹھتی رہیں جبکہ منجھولے اور چھوٹے قلمکار ہلکے انعاموں کی طرف لپک پڑے۔ ان اداروں کی چیرمین شپ اورممبر شپ کے لیے تو یہ حالت ہوگئی کہ غالبؔ، میرؔ کی ہمسری کے دعویدار نے برسراقتدار پارٹی میں چپراسی تک کا عہدہ قبول کرنے کا اعلان کردیا۔ یوں سمجھ لیں کہ اردو کا تخم مٹادینے والی جماعتوں نے روٹی کے ٹکڑے ہرسو پھینکے اور ہم ایک دوسرے کو روندتے پھاندتے ادھر کو جھپٹ پڑے کالج اور یونیورسٹی کے مدرسین نے بھی راستہ کھوج لیا۔ پی ایچ ڈی ٹکسال قائم کرلیں اورمتذکرہ انعامات سے زیادہ خزانہ پایا۔اردو تخلیق کاروں کی کتابیں پڑھنے والے گم ہوگئے۔ رسائل اوراخبارات کے خریدار گھٹتے گئے اور قاری بھی سمٹتا گیا۔اس نفسا

نفسی کے ماحول میں اردو زبان گونگے بہرے کی طرح اس بندر باٹ کا تماشہ دیکھتی رہی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اعزاز پانے والے ادیب وشاعر کسی بھی رسالے اس اخبار کی سرپرستی کرنے سے ہمیشہ کتراتے رہے۔ وہ صرف اعزازی طور سے آنے والے رسائل کی ورق گردانی کرنے کے عادی ہوگئے۔ بین الاقوامی شہرت کا تمغہ سجائے ممتاز، نامور، مقبول، منفرد، خوش فکر غرض بے شمار علمی فکری، صفتوں کے دانشور، نقاد، محقق، شاعر اور جینوئن پیرانہ سال ادیب جن کے پاؤں ہوائی جہاز اور اے سی کمپارٹمینٹ سے نیچے نہیں اترتے ان کی خواہشات کا آبشار اب بھی رنگِ شفق کا تمنائی ہے۔

سوچیئے کیا سمپورنانند، راجیندر پرساد اور ٹنڈن نے اردو کو SlowPiosoion دیا یا اپنی کتابوں کا بوجھ اٹھائے، انعامات اور مسند سے نوازے گئے نام ونمود کے خمار میں غرق اہلِ زبان اور دانشور جو زبان کو لقمۂ تر سمجھ کر عیش کر رہے ہیں وہ اردو کی زبوں حالی کے ذمہ دار ہیں؟ ذرا اُن سے پوچھئے کہ حکومت کو انہوں نے کتنے میمورینڈم دیے۔ نیم سرکاری اداروں کی سربراہی کے دوران کون سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جو اردو کے ریزہ ریزہ بادبان کی پیوندکاری میں معاون بنے ہوں؟ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ دانشور کبھی میدانِ عمل میں نہیں اترے بلکہ سیمیناروں میں اور مذاکروں میں لچھے دار الفاظ میں یہی درس دیتے رہے کہ اردو بڑی شیریں زبان ہے۔ اس کا مستقبل روشن ہے۔ جبکہ خود ان کے گھر میں بچے اس زبان کے شیرینی سے کوسوں دور ہیں۔ صوبائی اردو اکادمیز کے دستور میں اردو کی تعلیم کی ذمہ داری کا بیان بھی ہے۔ قومی

کونسل برائے فروغ اردو زبان جو حکومت ہند کی نوڈل ایجنسی ہے۔اس کا دستور بھی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ گا ہے بگا ہے مرکزی حکومت کو اردو زبان کی تعلیم اور فروغ کے بارے میں تجاویز پیش کرے۔افسوس ہے کہ ایسے اداروں کے ادب شناس ممبران بھی اس اہم کام کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ان حالات میں زبان کی ترقی کا واحد وسیلہ صرف اسکولی اردو تعلیم ہے۔آئین ۹۱ ویں ترمیم کے مطابق ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جاتی ہے۔اس طرف اردو کی انجمنوں کو عملی طور پر میدان میں آنا چاہیئے۔اور صوبائی سرکاروں سے مطالبہ کیا جائے کہ مادری زبان میں تعلیم دینے کا انتظام ہو۔بہت کچھ کیا جانا ہے لیکن رہنمائی کا پرچم اٹھانے والا کوئی نہیں۔''[۱]

اشتیاق عارف بھوپال کے نامور صحافی تھے۔ان کے انتقال سے بھوپال کے ادبی حلقے میں غم کی لہر دوڑ گئی۔نعیم کوثر کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں پر ہمیشہ تعریف،توصیف اور تبصرے کرتے رہتے ہیں۔انہوں نے اشتیاق عارف کے انتقال پر پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' کے ۱۵ر نومبر ۲۰۰۹ء کے شمارہ ۶۔۷۔میں اظہار تاسّف ان الفاظ میں کیا:

''وکٹر ہیوگو کا کہنا تھا۔''قوم کا اقتدار اعلیٰ، ہمہ گیر ووٹ اور آزادیٔ پریس۔یہ تینوں چیزیں تین مختلف ناموں کے پیراہن میں ایک ہی تنِ نگار حقیقت ہیں۔یہ عناصر نہ ہماری عوامی زندگی کی کلیت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔قوم کا غلبہ سیاسی آزادی پیدا کرتا ہے عام ووٹ سطح مساوات کو ہموار کرتا ہے اور پریس اخوت کا منبر خطابت بنتا ہے۔'' یہ حقیقت ہے کہ روئے زمین کے جس گوشے میں یہ عناسر ثلاثہ اپنی پوری توانائی سے پائے

۱؎ پندرہ روزہ صدائے اردو۔جلد۶۔شمارہ ۲۱۔۱۵ر جون۔۲۰۰۸ء۔ص ۱

جاتے ہیں وہاں جمہوریت بھی آب وتاب کے صورت گر نظر آئے گی۔

جناب اشتیاق عارف نے صحافت کے دشوار گزار خارزار کو حق کی استقامت کا میدان سمجھ کر تقریباً ۵۰ سال حریت، مساوات اور اخوت کو شریعت ’صحافت کا عنوان جلی قرار دیا۔ وہ ہمیشہ اہل واقعات اور ارباب خیالات سے ہم آہنگ رہے۔ اپنی معاشرت، مزاج، ادبی ذوق اور عادات تمام تر ترقی پسند اور سیکولر رجحان کی عکاسی کرتی ہیں۔

ان میں عقل و شعور اور قلمکاری میں عدم و انصاف کا مادہ تھا۔ انہوں نے ہمیشہ جذبات کو پس و پشت ڈالتے ہوئے عدل و انصاف کا ساتھ دیا۔ وہ سچے قوم پرست اور عوام دوست انسان تھے۔ انہوں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے اخبار میں محروم طبقہ کے مسائل کو ترجیح دیتے تھے۔ امپریلزم کی ملک ہوس گیری اور سیاسی قزاقی کا پردہ فاش کرتے تھے۔ فرقہ پرستی کسی بھی قوم اور طبقہ کی ہو۔ اشتیاق عارف انتہائی بیبا کی سے اس کی مذمت کرتے اور ایمانداری سے میدان عمل میں بھی اتر جاتے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے وہ برگ گل اور پارہ خارا کا نادر نمونہ تھے۔‘‘

راقم کو فخر ہے کہ صحافت کا ابتدائی سبق اشتیاق عارف صاحب کے زیر ادارت روزنامہ ’’افکار‘‘ اور روزنامہ ’’آفتاب جدید‘‘ میں بڑی محنت سے پڑھا ’’صدائے اردو‘‘ کے سلسلے میں وہ اپنے تجربہ اور ژرف نگاہی کی

ہم آغوش کے پیش نظر قدم قدم پر مشورے دیتے جن کے زیر اثر اخبار نے
قلم وقدم میں ۸ سال کامیابی سے پورے کیئے۔

میری آنکھیں نمناک ہیں۔ ہاتھ تھرتھراتے ہیں۔ کانپتے ہونٹوں سے
یہی صدا نکلتی ہے کہ رب کریم اشتیاق صاحب کو اپنے قرب و جوار میں جگہ
دے اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرما۔ (آمین)

نعیم کوثر''[۱]

اس طرح یہ کہنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ نعیم کوثر ایک اچھے افسانہ نگار اور صحافی ہونے کے ساتھ بہترین ناقد ہیں۔ انہوں نے پندرہ روزہ پرچے ''صدائے اردو'' میں جو اداریہ تبصرے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے تنقیدی مضامین وقتاً فوقتاً دیگر رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جس سے ہم نعیم کوثر کے تنقیدی شعور کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی تنقید بھی بے باک ہوتی ہے وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتے ہیں۔

نعیم کوثر کا بھوپال کے ناقدین میں بھی پایہ مسلم ہے ان کی تنقیدی صلاحیتیں ان کی ہر جگہ رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

---

[۱] پندرہ روزہ صدائے اردو۔ جلد ۹۔ شمارہ ۶۔۷۔ ۱۵ر نومبر۔ ۲۰۰۹ء۔ ص ۱

مجموعی جائزہ

یہ تحقیقی مقالہ جس کا عنوان ''نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے'' ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ان پر تحقیقی نگاہ کی جائے تو اس مقالے کی تکمیل کے ساتھ بہت سی نئی معلومات فراہم ہوئی ہیں اور فراہم شدہ معلومات کی تصحیح اور تفصیلات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

نعیم کوثر اس عہد کے نامور افسانہ نگار اور صحافی ہیں ان کا تعلق بھوپال سے ہے اور بھوپال میں اچھے نثر نگاروں اور خاص طور پر فکشن نگاروں کی تعداد کم ہے۔نعیم کوثر ایک بلند، معیاری افسانہ نگار ہیں۔ان کے مطبوعہ افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں کی تعداد ۹۶ ہے۔

بیشتر افسانے اردو افسانہ نگاری کے فن پر ہی پورے نہیں اترتے بلکہ ان کے موضوعات اور کردار موجودہ سماج کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ان کے افسانے سماج کی حقیقتوں کے ساتھ انسانی کرداروں کی نفسیات پر بھی ان کی گہری نگاہ کے غمّاز ہیں۔اس مقالے کا پہلا باب ''اردو افسانے کی تاریخ بطور پس منظر (ابتداء تا حال) ہے۔اس میں اردو افسانے کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اردو افسانہ نگاری کی تاریخ تفصیل سے اور جامع انداز میں پیش کی ہے۔تاکہ کوئی بھی اہم افسانہ نگار چھوٹ نہ پائے اور فن افسانہ نگاری کے ارتقاء میں اس کا حصّہ پوری طرح واضح رہے۔یہ باب اس لیے اہم ہے کہ اس میں افسانہ نگاری کے پس منظر کے ساتھ اس کے تدریجی ارتقاء پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے پس منظر کو مدّنظر رکھ کر ہی اگلا باب یعنی ''موجودہ دور میں بھوپال میں اردو افسانے کی

صورتِ حال'' ترتیب دیا گیا ہے اس میں بھوپال کے ان اہم افسانہ نگاروں کو پیش کیا گیا ہے۔ جنہوں نے بھوپال میں اردو افسانے کی صنف کو ترقی دی اور اس کا وقار اور معیار بلند کیا اس باب میں بھوپال کے افسانہ نگاروں اور افسانوی ادب کا بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور ان نئے لکھنے والوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے جنہوں نے چند افسانے ہی لکھے ہیں یا پھر ان کا ایک ہی مجموعہ منظر عام پر آیا ہے کچھ نئے نام بھی اس فہرست میں شامل ہوئے ہیں مثلاً ڈاکٹر شفیقہ فرحت، فیروزہ یاسمین، پری خانم، سلطانہ حجاب اور پروفیسر ارجمند بانو افشاںؔ وغیرہ۔

باب سوم ''نعیم کوثر کے سوانحی حالات اور شخصیت'' ہے۔ نعیم کوثر کے سوانحی حالات میں ابتداً ان کا شجرہ تحقیق کے بعد تحریر کیا ہے۔ نعیم کوثر کے والد نامور فکشن نگار کوثر چاند پوری کے یومِ پیدائش اور سنہ پیدائش کے سلسلے میں کئی اختلافات ہیں ان پر غور و فکر کرنے کے بعد دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر نازنین خان کی تحقیقی کتاب ''وقارِ علم و حکمت: کوثر چاند پوری'' جو کوثر چاند پوری پر ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس میں کوثر چاند پوری کی سنہ پیدائش صفحہ ۳۰ پر ۸/ اگست ۱۹۰۰ء تحریر کی ہے۔ اسی کتاب میں شامل ڈاکٹر مظفر حنفی کے مضمون میں بھی صفحہ ۵ پر بھی ۸/ اگست ۱۹۰۰ء ہے۔ ''وقارِ علم و حکمت: کوثر چاند پوری'' میں نعیم کوثر نے مختلف شواہد کی روشنی میں کوثر چاند پوری کی سنہ پیدائش ۱۸/ اگست ۱۹۰۰/ تحریر کی ہے۔ جو کوثر چاند پوری کی سروس بک کے مطابق ہے اور اسی کو درست ماننا مناسب ہے۔

نعیم کوثر کے سوانحی حالات میں ان کی جائے پیدائش ظفر احمد نظامی کے تحریر کردہ خاکہ ''نعیم کوثر۔۔۔ ایک تعارف'' میں بیگم گنج (ضلع رائسین) میں تحریر کی ہے۔ نعیم کوثر صاحب سے اس سلسلے میں بات کی تو ناراض ہو کر بولے تم کیا مجھے بیگم گنجی لکھو گے۔ ہم نے کہا آپ تو بھوپالی ہیں۔ ظفر احمد نظامی صاحب نے آپ کے خاکہ ''نعیم کوثر۔۔۔ ایک تعارف'' میں بیگم گنج بتایا ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ

والد صاحب ملازمت کے دوران بیگم گنج میں رہے اور وہیں ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو میں پیدا ہوا تھا۔

باب چہارم میں ''نعیم کوثر بحیثیت افسانہ نگار'' پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کو تحریر کرنے کے دوران نعیم کوثر کا ایک افسانوی مجموعہ ''کہرے کا چاند'' ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب اقبال مسعود کی ترتیب دی ہوئی ''نعیم کوثر کی افسانوی کائنات'' کے عنوان سے ۲۰۲۱ء میں منظر عام پر آئی اس میں اردو ادب کے نامور ادیبوں اور ناقدوں کے نعیم کوثر کی افسانہ نگاری پر تبصرے، تجزیہ اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب سے پہلے نعیم کوثر پر لکھے گئے مضامین کی ایسی کوئی کتاب نہیں ملتی جس میں ان پر تنقیدی مضامین لکھے ہوں۔ اس باب میں نعیم کوثر کے افسانوں کا گہری نگاہ سے مطالعہ کیا اور ان کے افسانوں کے موضوعات، کردار نگاری، جذبات نگاری، طرز بیان اور ٹیکنیک پر معتبر ناقدین کی آراء کو شامل کر کے تبصرہ اور تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کے ذریعہ درحقیقت ان کی افسانہ نگاری کی خوبیاں اور اردو افسانہ نگاروں میں ان کے مقام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بلاشبہ اس مقالے کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ نعیم کوثر کو اردو افسانہ نگاروں کی صف میں مناسب اور جائز مقام دیا جا سکے۔

اس مقالے کا باب پنجم ''نعیم کوثر بحیثیت صحافی، بحیثیت ناقد'' ہے۔ بھوپال میں صحافت کے تعلق سے نعیم کوثر کو کافی بلند مقام حاصل ہے جہاں بھی بھوپال میں صحافت کا ذکر ہوتا ہے نعیم کوثر کا نام سرفہرست ہوتا ہے۔ لیکن ان کی صحافتی خدمات کا مکمل جائزہ اس مقالے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ان کی اس ابتدائی کوشش کا بھی ذکر ہے جو انہوں نے اردو زبان و ادب سے سچی اور بے لوث اردو محبت کے ثبوت میں بچوں کا رسالہ ''جگنو'' جاری کر کے دیا۔ انہوں نے اس وقت میں ایسی خدمت اپنے سر لی جب ان کے پاس بچّوں کا رسالہ جاری کرنے کے لیے کوئی علیحدہ فنڈ نہیں تھا۔

اسی طرح پندرہ روزہ پرچہ ''صدائے اردو'' ۲۰۰۱ء میں جاری کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بھوپال کیا مدھیہ پردیش سے بھی کوئی باقاعدہ اور معیاری جریدہ شائع نہیں ہو رہا تھا۔ نعیم کوثر نے اس کمی کو محسوس کیا اور صرف نعرے بازی کے بجائے صحافت کے میدان میں یہ گراں قدر پرچہ جاری کیا۔ یہ بے لاگ اور بے باک پرچہ جو ادبی اعتبار سے بھی معیاری تھا۔ اخلاقی، شعری، ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے یہ پرچہ بڑی اہمیت کا حامل رہا۔ صحافت میں نعیم کوثر کی ادبی خدمات کو تو اس باب میں پیش کیا ہی گیا ہے۔ لیکن اس اخبار میں شائع ہونے والی ان کی تحریروں، اداریوں اور خبروں کے علاوہ دیگر کئی لوگوں کی کتابوں پر لکھے گئے ان کے تنقیدی مضامین اور نوٹ بھی اس باب میں پیش کئے گئے ہیں اور جن کی روشنی میں وہ ایک ترقی پسند نظریہ کے حامی اور حق پسند ناقد نظر آتے ہیں۔ ناقد کی حیثیت سے ابھی تک ان کی تحریروں پر کوئی ایسا مضمون یا کتاب نہیں ملتی جس میں انہیں ناقد کی حیثیت سے جانچا پرکھا گیا ہو۔ اس مقالے کے ذریعہ ان کی حیثیت ایک تنقید نگار کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔

آخر میں ان کتابیات، رسائل اور اخبارات کی فہرست ہے۔ جن سے اس مقالے کو تحریر کرنے میں مدد لی گئی ہے۔

بہرحال بحیثیت مجموعی نعیم کوثر پر ایک مکمل اور جامع مقالہ بنانے کی میری کوشش رہی ہے کہ کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہے۔ میں نے اس مقالے ''نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے'' کو ایک ادبی دستاویز کی شکل دینے کی کوشش کی ہے تا کہ نعیم کوثر پر آئندہ کام کرنے والوں کی رہنمائی ہو سکے۔

☆☆☆

NAEEM KAUSAR
HAYAAT AUR ADABI KARNAME

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN

(URDU)

2022

BARKATULLAH UNIVERSITY;
BHOPAL (M.P.)

PRESENTED BY :

SHAKEEL KHAN

UNDER THE SUPERVISION OF

Prof. ARJUMAND BANO

RESEARCH CENTRE

GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE, BHOPAL (M.P.)

NAEEM KAUSAR
HAYAAT AUR ADABI KARNAME

THESIS

SUBMITTED

FOR THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY (URDU)

2022

BARKATULLAH UNIVERSITY

BHOPAL (M.P.)

RESEARCH SCHOLAR

SHAKEEL KHAN

SUPERVISOR

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

Porf. ARJUMAND BANO

Professor Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & commerce
College, Bhopal. (M.P.)

PRINCIPAL
Govt. Hamidia Arts and
Commerce College, Bhopal

RESEARCH CENTRE

GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE, BHOPAL (M.P.)

نعیم کوثر: حیات اور ادبی کارنامے

مقالہ برائے ڈگری

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

2022

برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

پیش کردہ

شکیل خان

نگراں

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

پروفیسر ارجمند بانو

پروفیسر شعبۂ اردو

گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج، بھوپال

پرنسپل

PRINCIPAL
Govt. Hamidia Arts and
Commerce College, Bhopal

ریسرچ اسٹڈی سینٹر

گورنمنٹ حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج بھوپال۔ایم پی۔ 462001

Recommondation

I declare that the thesis entitled "NAEEM KAUSAR HAYAAT AUR ADABI KARNAME" is my own work conducted under the supervision of Prof. ARJUMAND BANO at GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE COLLEGE BHOPAL approved by Research Degree Committee. I have put in more than 200 days of attendance with the supervisor at the centre,

I further declare that to the best of my knowledge the thesis does not contain any part of any work which has been submitted for the award of any degree either in this University without proper citation.

Candidate

SHAKEEL KHAN

Supervisor:

Prof. ARJUMAND BANO
Deptt. of Urdu
Govt. Hamidia Arts & Commerce College
Bhopal (M.P.)

Prof. ARJUMAND BANO

PROFESSOR DEPTT. OF URDU
GOVT. HAMIDIA ARTS & COMMERCE
COLLEGE, BHOPAL (M.P.)